کے مابین جو اختلاف ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے، اقبال تصوف کے مخالف نہیں ہیں، مگر انھوں نے رہبانیت اور بدھ مت کے سنیاس سے جو اختلاف کیا ہے اس سے بعض لوگ ان کو تصوف کا مخالف سمجھ جاتے ہیں، خود مصنف بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں، ان کے بعض اشعار میں رہبانیت اور تصوف وغیرہ کا جو تقابل اور توافق نظر آتا ہے اس سے وہ تصوف مراد ہے جس کی تمام صوفیائے محققین نے مخالفت کی ہے، جس کا پنجاب اور سندھ میں رواج عام ہے، ان جزئیات کو چھوڑ کر کتاب میں اقبال کے نقطۂ نظر سے قریب پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تھوڑی دیر اہل حق کیساتھ ۔ از یونس نگرامی ندوی، صفحات ۸۴، کتابت و طباعت بہتر، ناشر مکتبہ طیبہ سی ۲۰۷/۲۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ،

اس کتابچہ میں بہت سے اہل حق کے سبق آموز واقعات مختلف کتابوں سے جمع کر دیے گئے ہیں، ان میں موضوع کے اعتبار سے کوئی ترتیب نہیں ہے، مگر ان واقعات کو پڑھکر عبرت و بصیرت دونوں پیدا ہوتی ہے، ان ہی بزرگوں کا طفیل ہے کہ دین اپنی اصلی صورت میں آجتک زندہ ہے، یہ کتاب کا دوسرا حصہ ہے پہلا حصہ اس سے پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے اگر چہ اس سال مصنف اس میں کچھ اپنا درد و سوز بھی شامل کر لیتے تو اس کی افادیت میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا۔

صُورِ اسرافیلؔ ۔ از حبیب پالنپوری، صفحات ۲۹۸، کتابت و طباعت عمدہ، پتہ ادارہ اشاعت دینیات، نظام الدین اولیاء، نئی دہلی ۱۳، قیمت ۳ ر

یہ ایک گجراتی شاعر حبیب پالنپوری کا مجموعۂ کلام ہے جسمیں غزلیں اور نظمیں دونوں ہیں، غالباً پہلی بار ان کا مجموعۂ کلام سامنے آیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں قدرت نے شاعری کی تمام صلاحیتیں جمع کر دی ہیں، انکے کلام میں علامہ اقبال کے ذوق حکیمانہ اور جذب عاشقانہ کی جھلک ملتی ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اہل ذوق میں ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

م ، ع

جلد ۹۶ ۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۵ء ۔ عدد ۲

مضامین

شذرات

حکومت مسلم یونیورسٹی کی تحریک دبانے پر تلی ہوئی ہے، ندائے ملت کے مسلم یونیورسٹی نمبر کی ضبطی اور اس کے عملہ کی گرفتاری اسی کا نتیجہ ہے، ورنہ جو پرچہ پبلک کے ہاتھوں میں پہنچا بھی نہیں تھا محض شبہہ کی بنا پر اس کی ضبطی اور اس کے عملہ کی گرفتاری کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے، اشاعت کے بعد اگر اس کا کوئی مضمون قابل اعتراض نظر آتا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کیجا سکتی تھی، اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرکے اولڈ بوائے کنونشن کو ناکام بنایا جائے، لیکن یہ امر قابل اطمینان ہے کہ کنونشن بخیر و خوبی کامیابی کے ساتھ انجام پا گیا، باہر کے ایک ہزار سے زیادہ نمایندوں نے شرکت کی، ایسے اجتماع میں نرم گرم تقریروں کا ہونا ناگزیر ہے، لیکن دونوں نے مل کر کنونشن میں اعتدال پیدا کر دیا تھا، ڈاکٹر سید محمود صاحب کی تقریر بڑی مؤثر اور قومی جذبات سے معمور تھی، کنونشن کے صدر یسین نوری صاحب کا خطبۂ صدارت نہایت متوازن اور مدلل تھا، انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کی روشنی میں بڑی خوبی کے ساتھ مسلمانوں کے دستوری حق کی وکالت کی جس میں یونیورسٹی کے متعلق ان کے تمام مطالبات آگئے ہیں، کنونشن میں جو تجویزیں منظور ہوئی ہیں ان کو عمل میں لانے کیلیے ایک کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس کنونشن کی کامیابی کا سہرا منشی احترام علی صاحب صدر استقبالیہ کے سر ہے۔

جب حکومت یقین دلاتی ہے کہ یونیورسٹی کا کردار نہ بدلا جائیگا اور مسلمان یہی چاہتے ہیں تو پھر مسلمانوں کی پرامن کوشش کو سختی سے دبانے کے کوئی معنی نہیں، البتہ کردار کے مفہوم کی تعبیر و تعیین میں اختلاف ہو سکتا ہے

لیکن اصولاً اس کی تعیین کا حق صرف مسلمانوں کو ہے، اور وہی کردار صحیح مانا جائیگا جو مسلمان متعین کریں، اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کہ نام کے لیے یونیورسٹی کا نظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے، لیکن کورٹ اور اکزیکیٹو کونسل کو یونیورسٹی کے ملازمین اور حکومت کے نامزد کردہ مسلم اور غیر مسلم ممبروں سے بھر دیا جائے، اور اس کی حیثیت گھٹا کر وائس چانسلر کی مجلسِ مشاورت کی کر دیجائے، یہ تو محض ایک کھیل ہوگا جس میں بظاہر یونیورسٹی کا نظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے گا لیکن حقیقۃً اس کی باگ حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گی اور اس کی خودمختار حیثیت اور اس کا کردار دونوں ختم ہو جائیں گے، اس قسم کے کھیل بہت پرانے ہو چکے جو اس زمانہ میں نہیں چل سکتے۔

اس مسئلہ کے حل کی شکل صرف یہی ہے کہ یونیورسٹی ایکٹ میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کیجائے جس سے اس کے کردار اور اس کی خودمختاری میں فرق آئے، اس کے سارے پہلوؤں پر بیانات اور مضامین نکل چکے ہیں، ہم بھی گذشتہ پرچہ میں اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں، اور کنونشن نے ان مطالبات کو جامع اور مرتب شکل میں پیش کر دیا ہے، اس کے علاوہ جو شکل بھی اختیار کی جائے گی اس سے مسلمان کبھی مطمئن نہ ہونگے، ان میں اور حکومت میں، ایک مستقل کشمکش پیدا ہو جائے گی جو دونوں کے لیے مضر ہوگی، اس قضیہ کے حل کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمدرد یونیورسٹی کے کورٹ اور اکزیکیٹو کونسل کی جو شکل ہے وہی مسلم یونیورسٹی میں بھی جاری کر دیجائے، گو بعض حیثیتوں سے ان دونوں کا موازنہ بھی صحیح نہیں ہے، اس کے حکومت کے نامزد کردہ ارکان بھی اس کے کردار کے سب سے بڑے محافظ ہوں گے، یہ فخر تو صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کو حکومت کی خوشنودی کے لیے ملت فروشی میں بھی عار نہیں ہوتا اور ہندو یونیورسٹی میں مسلمانوں کی مؤثر حیثیت کیا ان کی ممبری کا بھی کوئی سوال نہیں ہے۔

گذشتہ مہینے ہم نے پاکستان میں سیرۃ النبیؐ کی پہلی اور دوسری جلد کی تلخیص و اشاعت پر جو شذرہ لکھا تھا اس کو پڑھ کر ملتان کے ایک مخلص نے خط لکھا ہے کہ "آپ سیرۃ النبیؐ کے خلاصہ کو رو رہے ہیں، یہاں شیخ عبد السلام مالک آئینۂ ادب انار کلی لاہور نے آپ کی پوری سیرۃ النبی چھاپ لی ہے، جب میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے تو کہنے لگے کہ ہم نے ان کی اجازت سے چھاپی ہے، میں نے ان کی دوکان کے فارم پر ان کی قیمتیں بھی لکھوائی ہیں جو روانہ ہیں" یہ اطلاع دینے والے ایک ثقہ اور صاحب علم بزرگ ہیں، اس لیے اس کی صداقت میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں، ابھی لاہور کے ایک معتبر ادارہ نے خبر دی ہے کہ بعض ناشروں نے شعر الہند اور گل رعنا چھاپ لی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس اندھیر کا کیا علاج ہے، اس کے معنی ہیں کہ پاکستان میں دار المصنفین کی تجارت جس پر اس کی آمدنی کا دارو مدار ہے بالکل ختم ہو جائے گی، اور تنہا ہندوستان کی آمدنی پر وہ چل نہیں سکتا۔

گذشتہ مہینہ بھی ہم نے پاکستان کے مخلصین کو اس اندھیر کی طرف توجہ دلائی تھی، ہماری درخواست پر جناب شورش کاشمیری نے دار المصنفین کی ہمدردی کا پورا حق ادا کیا، ان نئی خبروں کے بعد بھی اس کے سوا ہمارے بس میں کیا ہے کہ پاکستانی اخبارات و رسائل اور وہاں کے اصحاب علم و قلم سے اس کی فریاد کریں کہ پاکستان کے قیام کے طفیل میں ہندوستان کے مسلمان تو تباہ و برباد ہو ہی چکے ہیں، یہاں جو نیم جان اسلامی ادارے باقی رہ گئے ہیں ان کو پاکستان کے خود غرض تاجر تباہ کرنے پر آمادہ ہیں، کاش پاکستان کی حکومت کے کانوں تک ہماری آواز پہنچ سکتی، کیا اب وہاں کوئی سردار عبد الرب نشتر باقی نہیں رہا جو دار المصنفین کو پاکستان کے خود غرض تاجروں سے بچا سکے، پاکستان خصوصاً لاہور میں دار المصنفین کے قدر دانوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے، ہم کو امید ہے کہ وہ اس کے تدارک کی کوشش کرے گا،

مقالات

عربی تحریر کی ابتدا و ترقی

از جناب مجیب سمیع اللہ صاحب ایم اے لکچرار مولانا آزاد کالج کلکتہ

عرب کی تمدنی زندگی میں ادب و زبان کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ دنیا کا کوئی ملک اس کو فراموش نہیں کر سکتا، عرب نے ادب و زبان میں وہ بلندی حاصل کی تھی جس کی مثال بہت کم ملتی ہے، خصوصاً قلیل مدت میں عربی شاعری کی حیرت انگیز ترویج و اشاعت معجزہ سے کم نہیں ہے، اس زمانہ میں جبکہ دنیا بڑی حد تک شاعرانہ احساسات سے محروم تھی، عرب کے بادیہ نشینوں میں شاعری کا لطیف احساس پیدا ہوا، محبوب کا تصور اور اس کی یاد ان کے لیے سرمایۂ حیات بن گئی، ویران اور لق و دق بیابانوں میں مکانات کے کھنڈر عشق و الفت کے مرثیہ خواں نہیں بلکہ ان کی پاک اور سچی محبت کی دلیل تھے، جو دیار محبوب تک پہنچنے کی راہ بتاتے تھے، عربی شاعری اپنے ابتدائی دور ہی میں شعر و فن کے کمال تک پہنچ چکی تھی، چھٹی صدی ق، م میں عربوں میں شعری حس پیدا ہوئی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں عرب میں باضابطہ شاعری کا آغاز ہو گیا، اور اسلام سے کچھ پہلے اس اوج کمال پر پہنچی کہ نقادانِ فن حیرت میں پڑ گئے[1]، عہد عباسیہ میں عربی زبان و ادب انتہائی عروج پر تھا، مگر وہ شعری حسن و لطافت جو بعثت رسول کے وقت حاصل تھی، وہ دور عباسی میں نصیب نہ ہو سکی، اور آج جبکہ یورپ نے ادب و زبان اور شعر و فن میں بے انتہا ترقی کی ہے بعض نقادوں کے نزدیک وہ عربی شاعری کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے،

---

[1] نکلسن: عربوں کی تاریخ ادب، ص ۲۷

عام طور سے مشہور ہے کہ جس زمانہ میں عربی شاعری انتہائی عروج پر تھی، اُس زمانے میں تحریر اور تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا، شعراء زورِ بیان اور سلاستِ بیان سے بازاروں، درباروں اور جنگ کے میدانوں میں اپنے اشعار سے آگ تو لگا سکتے تھے، مگر اپنے دلی جذبات اور قلبی تاثرات کو کاغذ پر نقش کرنا نہیں جانتے تھے، بعض مورخین اور علمائے ادب کا خیال ہے کہ گنتی کے چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے[1]، ایک روایت کے مطابق عرب میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لیے شاعری کا سرمایہ کس طرح محفوظ رہا، اور آئندہ نسلوں تک کس طرح پہنچا، یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ عام طور سے عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا لیکن وہ سرے سے اس سے ناواقف نہیں تھے، اور مختلف شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ فنِ تحریر دورِ جاہلیہ میں کوئی بے معنی لفظ نہیں تھا، کتابت و تحریر کا باضابطہ نہیں تو کم از کم ایک حد تک رواج تھا،

اس سلسلہ میں یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ عربی خط کب اور کیسے ایجاد ہوا، اس کا یقینی جواب دینا بہت مشکل ہے، تاریخ کے اوراق اس بارہ میں یا تو خاموش ہیں یا افسانوں میں گم ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائشِ آدم سے پہلے ہی عربی خط موجود تھا، لیکن ایسی روایتوں کو تاریخی استناد کا درجہ حاصل نہیں، اتنا مسلم ہے کہ عربی زبان سامی زبان کی ایک شاخ ہے، اور اس سلسلے کی تمام زبانوں میں یہ سب سے آخری زبان ہے، ان تمام زبانوں میں ترکیبِ کلام اور الفاظ وغیرہ کے لحاظ سے بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے[2]، انیسویں صدی میں میخی کتبوں کی تحقیق اور سریانی، بابلی، عبرانی، آرامی، عربی وغیرہ کے تقابلی مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان تمام زبانوں میں مادے سہ حرفی ہیں، زمانے صرف دو ہیں ماضی اور حال (مضارع) گردان کا طریقہ بھی ایک ہی ہے، الفاظ کے چھ اجزا ہیں اسمائے ذاتی

۱؎ بلاذری: فتوح البلدان ص ۴۷۱-۴۷۲، ۴۷۴؛ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۲ ۲؎ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا ج ۲۰ ص ۳۱۵

۳؎ پروفیسر ہٹی: (P.K. Hitti): تاریخ عرب ص ۸

اسمائے علاقی، واحد و جمع اور اعضائے جسم کے نام بھی بالکل ایک ہیں[1]، ہر زبان میں حروف اصلی بائیس ہیں، عربی میں بھی بائیس ہی حروف ہیں، اخیر کے چھ حروف ثخذ ضظغ (ث، خ، ذ، ض، ظ اور غ) ضرورت کے لحاظ سے بڑھائے گئے ہیں، اس سلسلے کی سب سے پہلی زبان بابلی کے کتبے ۲۲۵۰ ق م کے ہیں اور عربی خط میں تقریباً چھٹی صدی عیسوی کے لکھے ہوئے کتبے ملے ہیں، ضرورت کے مطابق زمانے کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ان کے خطوط میں بھی تغیر ہوتا رہا ہے، ابتدا میں خیالات و جذبات کو لکیروں، نقوش اور خاکوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا تھا، رفتہ رفتہ یہ نقوش بدلتے رہے، اور آخر میں انھوں نے موجودہ حروف کی شکل اختیار کر لی، اس کے برعکس موجودہ عربی حروف قرنہا قرن پہلے وجود میں آگئے تھے، اس کے باوجود اس کے موجودہ خط اور خط کوفی میں کافی فرق ہے، خطوط کی تاریخ ارتقا سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی خط بابلی خطِ تحریر کی آخری ترقی یافتہ شکل ہے یا کم از کم جنوبی عربی یعنی حمیری زبان کا خط موجودہ طرزِ تحریر کی ابتدائی صورت ہے، چنانچہ حمیری زبان میں ایسے بے شمار کتبے ملے ہیں، ان کتبوں کی تعداد چار ہزار سے اوپر ہے جو ساتویں آٹھویں صدی قبل مسیح میں لکھے گئے تھے[2]،

مغربی محققین کے ذریعہ حمیری زبان وغیرہ کے جن کتبوں کا علم ہوا ہے، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں دو بولیاں رائج تھیں، ایک شمالی عرب کی بولی، دوسری جنوبی عرب کی، جنوبی عرب یعنی یمن، سبا، حمیر وغیرہ میں حمیری زبان بولی جاتی تھی، مگر ابی سینیوں نے جب حمیری سلطنت کا تختہ چھٹی صدی عیسوی میں الٹ دیا تو جنوبی بولی مردہ ہو گئی اور شمالی بولی ترقی کر گئی، سبا اور حمیر کے عربی خطوط کے نمونے سنہ عیسوی کی ابتدا ہی میں پائے جاتے

۱؎ انسائیکلوپیڈیا امریکہ Encyclopaida Americana ج ۲؎ پروفیسر پی کے ہٹی: تاریخ عرب ص

۳؎ ایضاً ص ۵۱

ہیں، بلکہ حجر اور صفا کے شمالی عربی خطوط کا پتہ سنہ مسیح کے بھی قبل سے چلتا ہے، اس کے عرصۂ دراز
کے بعد زبد کے ۵۱۲ء کے سہ زبانی (سریانی، ایرانی اور عربی) کتبوں اور حران کے ۵۶۸ء کے
دو زبانی (یونانی اور عربی) کتبوں کا پتہ چلا ہے،[1] یہ خطوط عموماً پتھر کی دیواروں اور چٹانوں پر پائے جاتے
ہیں، شمالی عرب کے مسافر جب ان کتبوں کے پاس سے گذرتے تو ان کو غور سے دیکھتے اور
پڑھنے کی کوشش کرتے تھے، ہمدانی نے کتاب الاکلیل میں لکھا ہے کہ لوگ اس زبان سے اچھی طرح
واقف نہیں تھے، پھر بھی کچھ نہ کچھ مطلب سمجھ جاتے تھے، ہمدانی خود اس زبان کے علم ہجا سے ناواقف تھا،[2]
سبا اور حمیر کی سلطنت کا زمانہ ۸۰۰ ق م سے ۵۲۵ء تک پھیلا ہوا ہے، اور کتبوں ہی سے
ان کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، یمن کے ایک محقق کارسٹن نائیبور (Carsten Neibhur)
نے جس کی کتاب صفت عرب (Beschrungen Von Arabien) ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی
تھی، بتایا ہے کہ وہ کتبے جن کو حمیر سے منسوب کیا جاتا تھا، در اصل اس دور کے مشہور شہر ظفار میں
موجود تھے، ۱۸۱۰ء میں اُلرخ یاسپر زیٹین (Ulrich gasper Seetzen) نے ظفار
میں جو مختلف کتبے دریافت کیے تھے ان کی نقلیں بھی کرائی تھیں، اس نے ایک ایسا کتبہ بھی خریدا تھا
جو اس کی سمجھ سے باہر تھا،[3] جنوبی عرب کے وہ کتبے جو سب سے پہلے یورپ میں لائے گئے، ان سے جنوبی مغربی
عرب کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے، جے، آر، ویلسٹڈ (J.R. Wellsted) نے
حصن غراب اور نقب الحجر کے کتبوں کو اپنی تصنیف "عرب میں سیر و سیاحت" (Travels
in Arabia) میں ۱۸۳۸ء میں شائع کیا تھا، اسی زمانے میں ایمل رو دیگر
(Emil Rodiger) کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ برلن کی Royal
Library[4] میں بھی بہت سے کتبے موجود تھے، انگلستان، جرمنی اور فرانس نے بھی

[1] آر، اے، نکلسن: عربوں کی تاریخ ادب، ص ۱ تا ۲ (دیباچہ) [2] ایضاً ص ۳ [3] ایضاً ص ۷، ۸ [4] یہ کتب خانہ
دوسری جنگ عظیم کے وقت ٹوبنگن (جرمنی) میں منتقل ہو گیا تھا۔

کتبوں کی دریافت میں حصہ لیا تھا، ۱۸۴۳ء میں Thomas Arnaud نے مآرب
کے کھنڈر اور قدیم سبائی دار السلطنت کے کتبے دریافت کیے تھے، ان میں سے ساٹھ کتبوں کو
اس نے نقل بھی کیا تھا جو بعد میں جرنل ایشیاٹک (Journal Asiatique) میں شائع ہوئے، جوزیف ہالوی
(Joseph Halevy) ایک یہودی فاضل نے ۱۸۶۹ء میں جوف کا جو صفا کے مشرق
میں واقع ہے سفر کیا، اور بڑی تحقیق اور مشقت کے بعد سات سو کتبوں کی نقلیں اپنے ساتھ لایا،
اس کے علاوہ ای گلاسٹر (E. Glaster) اور جولیس ایوٹنگ (Julius
Euting) نے بھی کتبوں کی دریافت کے سلسلہ میں بڑی صعوبتوں کا سامنا کیا ہے۔[1]

ان مختلف کتبوں سے عرب کی قدیم تاریخ کا پتہ چلتا ہے، مثلاً قبیلۂ نباط کے لوگ حضرت
عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے حکومت کرتے تھے، اور شہری اور مدنی زندگی بسر کرتے تھے۔
(Petra) کی سلطنت انہی کی کوشش کا نتیجہ تھی، مگر تحریر کے لیے ارامی (Aramaic) خط
استعمال کرتے تھے، بہت سے کتبوں سے لحیان کے بادشاہوں کی حکومت کا پتہ چلتا ہے،
۳۲۸ء کا ایک کتبہ امرء القیس کی حکومت کے بارے میں اہم معلومات بہم پہنچاتا ہے،[2]
اس کی حکومت ازد و نزار تک پھیلی ہوئی تھی۔

ان کتبوں کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حمیری خطوط کے ساتھ ساتھ عربی خط تحریر
بھی دور جاہلیہ ہی میں رواج پا چکا تھا، جوزف ہیل نے اپنی جرمن کتاب "التمدن عرب" میں لکھا ہے
کہ عہد جاہلیہ میں عربی شاعری کے ساتھ عربی خطوط کی بھی کافی ترقی و اشاعت ہوئی تھی،[3]

عربی تحریر کا رواج صرف عرب ہی میں نہ تھا، بلکہ اس سے قبل دوسرے مقامات میں بھی

[1] آر، اے نکلسن: عربوں کی تاریخ ادب، ص ۸، ۹؛ پی کے ہٹی: تاریخ عرب، ص ۵۰-۵۲ [2] جوزف ہیل: تمدن عرب
(The Arab civilization) (ترجمہ صلاح الدین خدا بخش خاں) ص ۸-۹
[3] ایضاً ص ۱۵-۱۶

اس کا رواج ہو چلا تھا، بعثت نبوی سے پہلے حیرہ میں عسائی کافی تعداد میں سکونت پذیر تھے، جو عباد یعنی بندگان خدا کہلاتے تھے، ان کا ادبی ذوق بہت ہی ستھرا اور نکھرا ہوا تھا، انھوں نے عربی تحریر کی باضابطہ تعلیم پائی تھی، ان کے عربی تحریر کے بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں، حیرہ کے شاعروں کے لکھے ہوئے اشعار خصوصاً عدی بن زید کا کلام تحریری شکل میں موجود تھا، مگر اب اس کے بہت سے حصے ضائع ہو گئے ہیں،[۱] حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کے پاس مشہور شاعروں کی نظموں کا ایک مجموعہ تھا، جو اس کی اور اس کے خاندان کے افراد کی مدح پر مشتمل تھا، جب اموی برسر اقتدار آئے تو یہ مجموعہ ان کے قبضہ میں چلا گیا، جب امرؤ بن ہند (حیرہ کا ایک بادشاہ) ۵۵۴ء میں تخت نشین ہوا تو طرفہ اور اس کا چچا تلاش معاش میں حیرہ پہنچے، طرفہ بڑا زبان دراز اور تنک مزاج تھا، اس لیے امرؤ بن ہند کی ہجو لکھی اور اس کی بہن پر عاشق ہو گیا، امرؤ بن ہند ان سے برہم ہو گیا اور دونوں کو ایک ایک سربمہر مکتوب دے کر حاکم بحرین کے پاس بھیجا، جس میں ان کو قتل کرنے کا حکم تھا، اسی لیے طرفہ قتل کر دیا گیا،[۱]

زہیر بن ابی سلمیٰ اور اس کے لڑکے کعب بن زہیر کے قصیدوں کی شرح سکری میں ہے کہ زہیر کے خاندان والوں کے منتخب قصیدے بنو غطفان کے پاس محفوظ تھے، اس کے علاوہ دور جاہلیہ میں عربی زبان کے دوسرے مخطوطات کا بھی پتہ چلتا ہے، زبیر بن بکار کا بیان ہے کہ الکثیر کی لڑکی جمعہ کے لڑکے نے کہا کہ اس کے والد کی کتابوں میں ایک ایسی کتاب بھی تھی جس میں الکثیر کے بہت سے قصیدے بھی تھے،[۲] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتابیں یا تو دور جاہلیۃ کی تصنیف تھیں یا ابتدائے اسلام کی، اس لیے کہ الکثیر ۱۰۵ھ میں یزید بن عبد الملک کے عہد میں انتقال کر چکا تھا،[۳]

اسلام سے پہلے عرب میں جا بجا تجارتی منڈیاں قائم تھیں، جن میں ضرورت کی چیزیں اور دوسرے لوازمات ملتے تھے، عکاظ، ذوالمجاز اور مکہ بڑے تجارتی مراکز تھے، یہ مقامات نہ صرف تجارتی

۱؎ آر، اے نکلسن عربوں کی تاریخ ادب ص ۱۴۲ ۲؎ نکلسن: ص ۱۰۷-۱۰۸ ۳؎ کتاب الاغانی، مصر، ادیشن [illegible] احمد شنقیطی ۹، ص ۲۵ ۴؎ ایضاً ج ۸ ص ۷۶

منڈیوں کے لیے مشہور تھے، بلکہ ان کی ادبی اور شعری معرکہ آرائیوں کی وجہ سے بھی ان کی شہرت تھی، عکاظ میں بیس روز تک میلہ لگتا تھا، جس میں دور دور کے لوگ آ کر شریک ہوتے تھے، میلہ میں بڑی رونق رہتی تھی، جو اس کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی تھی، مکہ میں خانہ کعبہ تھا، اس لیے حج بیت اللہ اور میلہ کی وجہ سے رفتہ رفتہ حجاز اور مکہ میں لوگوں نے بود و باش اختیار کر لی تھی، ان میں اسلام سے پہلے کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، جن میں زیادہ تر تاجر تھے،[۱] عکاظ میں سال میں ایک مرتبہ شعری معرکہ بھی ہوتا تھا، ملک کے مختلف مقامات کے شعرا اپنی بہترین نگارشات کے ساتھ اس میں شریک ہوتے، اور مقابلہ میں حصہ لیتے تھے، نابغہ ذبیانی عموماً اس بزم مشاعرہ کا صدر ہوتا تھا، اور جو قصیدے اس میں پڑھے جاتے تھے ان میں سب سے بہتر قصیدہ ہونے کا فیصلہ کرتا تھا، جو قصیدہ سب سے بہتر قرار پاتا اسکو نہایت نفیس چمڑے پر سنہرے حرفوں میں لکھ کر کعبہ کی دیوار پر تشہیر کے لیے آویزاں کیا جاتا، ایسے قصیدے معلقہ کے نام سے موسوم ہیں،

معلقہ، مادہ علق سے ہے جس کے معنی بہت ہی قیمتی شے کے ہیں، اور چونکہ قصیدہ کو ایک قیمتی کپڑے یا چمڑے پر لکھ کر معلق کیا جاتا تھا، اس لیے اس کا نام معلقہ پڑ گیا، کسی نظم یا قصیدہ کو بغیر ضبط تحریر میں لائے ہوئے کسی دیوار سے معلق کرنا ناممکن ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معلقات بھی لکھے جاتے تھے، بعض لوگوں کے نزدیک ایسے انعام یافتہ قصیدے 'مذہبات' کے نام سے مشہور ہیں، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایسے قصیدے سونے کے پانی سے لکھے جاتے تھے، مخضرم شاعروں میں کچھ لوگ 'اصحاب مذہبات' کے نام سے مشہور ہیں، اصحاب مذہبات ایسے شاعر ہیں جن کے منتخب اشعار سونے کے پانی سے لکھے جاتے تھے، اس مذہبہ کہلاتے تھے،[۲] قیس بن الخاطم کے ایک شعر سے معلقات کی اس توجیہ پر روشنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے

"کیا تم (ایک مکان) کے نشانات کو جانتے ہو جو چمڑے پر سونے کے پانی سے لکھے ہوئے ہیں"

۱؎ جوزف ہیل، ترجمہ صلاح الدین خدا بخش خاں (The Arab civilization) ص ۱۱ (دیباچہ) اور
۲؎ سعید انصاری: سیر انصار، ج ۱ ص ۳۲۷

قیس کے اس شعر سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معلقات سونے کے پانی سے لکھے جاتے تھے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی خوبصورت تحریروں سے لوگ عام طور پر واقف تھے،

آج کل کی طرح خط و کتابت اور تحریری کاموں میں عرب میں کاغذ کا استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ عام طور سے چمڑے، پتیاں اور کبھی کبھی چپٹے پتھر کا استعمال کیا جاتا تھا، ان کے علاوہ بعض دوسری چیزیں بھی لکھنے کے کام میں آتی تھیں، جس کا واضح اشارہ شاعروں کے کلام میں ملتا ہے، امرء القیس ایک شعر میں کہتا ہے:

لمن طلل ابصرته فشجانی ‏ ‏ ‏ ‏ کخط الزبور فی العسیب الیمانی [1]

آخر وہ کھنڈر کس سے تعلق رکھتا ہے جسے میں نے دیکھا اور جس نے مجھے مغموم کر دیا ہے اور جو یمن کے کھجور کی پتیوں پر لکھی ہوئی کتاب کی تحریر کی مانند ہے۔

ایسی متعدد مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت عام طور سے عسیب ہی پر ہوا کرتی تھی، چنانچہ بطلیوسی اپنی شرح میں لکھتا ہے کہ عسیب کھجور کی پتیوں کے ٹکڑے کو کہتے ہیں، مسلمان عہد نبوی میں تحریر کے لیے کھجور کے پتے اور چپٹے پتھر استعمال کرتے تھے،[2] مگر امرء القیس کے اشعار میں صرف کھجور کے پتے ہی کا ذکر ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں چپٹے پتھر استعمال نہیں ہوتے تھے، یا ان کا عام رواج نہ تھا، زیادہ تر کھجور کے پتوں ہی کا استعمال تھا، چنانچہ یمن کے لوگ انہیں پر اپنے کارنامے اور ان میں جو معاملات ہوتے تھے ان کے معاہدے لکھتے تھے،

حاتم طائی کے بیان کے مطابق وہ اور اس کے احباب تحریر سے واقف تھے، فیاض ہونے کے علاوہ وہ شاعر بھی تھا، اس نے تحریر اور آلۂ تحریر کا ذکر اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:

اتعرف اطلالا و نؤیا مهدما ‏ ‏ ‏ ‏ کخطک فی رق کتابا منمنما [3]

[1] دیوان امرء القیس (بہ تحقیق حسن السندوبی) ص ۱۴۴ شعر ۱، [2] دیوان (قاہرہ اڈیشن) ص ۱۰۰
[3] دیوان (Schulthess شولتس) ص ۴۲

کیا تم اس کھنڈر اور ویران خندق کو جانتے ہو جو تمہاری ایسی تحریر کی طرح ہے جو مہین چمڑے پر لکھی گئی ہو

جزیرۃ العرب میں دستیاب شدہ کتبوں، جاہلی شعراء کے کلام اور دیگر مخطوطات سے اتنا بہر حال ثابت ہے کہ اس دور میں کم از کم خواص میں تحریر کا رواج تھا، یہ صحیح نہیں ہے کہ تحریری ادب کی ابتدا قرآن کے بعد سے ہوئی، اور عباسی دور میں اس کا باضابطہ رواج ہوا، بلکہ اگناس گولڈسہیر (Ignaz Goldziher) نے یہاں تک لکھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عربی کی نثری کتابیں بالکل ناپید نہیں تھیں، اور عرب بعض کتابوں سے واقف تھے،[1] اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ قصیدے یا دوسری کتابیں اسلام سے پہلے نہیں بلکہ دور عباسیہ میں ضبط تحریر آئیں تو یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ شاعروں کے کلام میں تو عربی تحریروں کے حوالے موجود ہوں، مگر حقیقتاً اس دور میں ان کا وجود نہ ہو، جو منطقی نقطۂ نظر سے بالکل بعید ہے، قوت متخیلہ الہامی طور پر یا خدا کی طرف سے ودیعت نہیں کی جاتی بلکہ مشاہدات اور تجربات سے یہ قوت پیدا ہوتی ہے جب انسان کے اندر یہ قوت بدرجۂ اتم موجود ہو تو وہ مختلف اسباب اور اشیاء کے اختلاط سے ایک نیا تصور پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، مگر جب ہم ان حوالجات کا بغائر مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ نہ تو ان کی قوت متخیلہ کا کرشمہ تھا، نہ الہامی نزول کا نتیجہ، بلکہ یہ محض ایک حقیقت کا اظہار تھا، کرنکو (F. Krenkow) اپنے ایک مقالہ میں لکھتا ہے کہ عرب میں تحریر کا عام طور پر رواج تھا، اور ایک حد تک تحریر کمال پر تھی، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ قدیم شاعر تحریر کی افادیت سے اور حروف کی ساخت سے نابلد نہیں تھے،[2] ذیل میں چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں، جس سے اس پر مزید روشنی پڑے گی،

اسلام سے پہلے قبیصہ ابن کلثوم السکونی، سردار جنوبی عرب، حج کعبہ کے ارادہ سے مکہ جا رہا تھا،

[1] اسلامی مطالعات (Muhammadanische Studien) ج ۲ ص ۲۰۴-۲۰۵
[2] مشرقی مطالعات کی ایک کتاب (A volume of Oriental Studies) ص ۲۶۴

راستے میں عامر بن عقیل کے قبیلہ کے لوگوں نے اس کو گرفتار کرکے قید کردیا، چند سال تک وہ قید میں رہا، حسن اتفاق سے ایک بار وہ شاعر ابو الطمحان القینی وہاں سے گذرا، قیسبہ کو جب معلوم ہوا کہ ابو الطمحان یمن جارہا ہے تو اس نے اپنی زین کھول کر اس پر یمنی تحریر میں اپنے پانچ اشعار لکھے، جو اس کی رہائی کا ذریعہ بنے[1]، کتاب الاغانی میں اشعار موجود ہیں،

شاعر ابو النجم کہتا ہے

اقبلت من عند زیاد کالخرف[2]　　　یخط رجلای بخط مختلف

تکتبان فی الطریق لام الف[3]

میں زیاد کے یہاں سے ایک صاحب فن کی طرح آیا جبکہ میرے پیر مختلف خطوط بنارہے تھے اور راستہ پر لام الف لکھتے جارہے تھے۔

مرقش اکبر کا ایک شعر ہے،

الدار قفر والرسوم کما　　　رقش فی ظہر الادیم قلم

خانہ یار ویران ہے مگر نشانات ایسے واضح ہیں جیسے قلم چمڑے پر لکھتا ہے۔

ابو داؤد الکلابی کہتا ہے،

لمن طلل کعنوان الکتاب　　　ببطن اُفاق او بطن الذُّہاب[4]

یہ وادیٔ افاق یا وادیٔ ذہاب کے کھنڈر جو ایک کتاب کے ٹائٹل کی طرح ہیں کس سے تعلق رکھتے ہیں؟

اخطل نے قدیم مخطوطات کو دیکھا تھا، چنانچہ وہ کہتا ہے؛

کانما ھی من تقادم عھدھا　　　ورق نشرت من الکتاب بوالی

جیسے یہ باوجود ایک مدت مدید کے گذرنے کے ایک کتاب کے بوسیدہ اوراق کی طرح ہیں جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔

[1] کتاب الاغانی (مصری اڈیشن) ج ۹ ص ۱۲۵-۷۷ [2] خرف کے معنی نقطے بنانے والے کے بھی ہیں [3] خزانہ ج ۱ ص ۴۸ [4] سمہ کبری ص ۱۱۵

ابتدائے اسلام کا ایک شاعر شماخ کہتا ہے

کما خط عبرانیۃً بیمینہ　　　بتیماء حبرٌ ثم عرض اسطرا[1]

ٹھیک اسی طرح جیسے تیماء کا ایک یہودی راہب اپنے داہنے ہاتھ سے عبرانی لکھتا ہو اور پھر (آگے لکھنے کے لیے) خط کھینچا ہے۔

اس سے بہت پہلے حارث بن حلزہ نے اپنے ایک شعر میں ایک دوسرے قسم کے خط کا ذکر کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

یہ الجبس کے مکانات کس کے ہیں، جو ویران ہوگئے ہیں، اگرچہ ان کے صاف نشانات ایرانیوں کے لکھے ہوئے کارناموں کی طرح ہیں[2]۔

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز تھی جو عبد المطلب بن ہاشم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، وہ یہ تھی:

حق عبد المطلب بن ھاشم من　　　یہ عبد المطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرض

اھل مکۃ علی فلان ابن فلان الحمیری　　　فلاں شخص پر ہے جو صنعا کا رہنے والا ہے، یہ چاندی

من اھل وزل صنعا علیہ الف درھم　　　کے ہزار درہم ہیں، جب طلب کیا جائیگا وہ ادا کر دیگا

فضۃ کیلاً بالحدیدۃ ومتی دعاہ　　　خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں[3]،

بھا اجابہ شھد اللہ والملکان (ابن ندیم ص ۸ طبع مصر)

ربیعہ بن نصر کی موت کے بعد جب حسان بن تبان یمن کا بادشاہ ہوا، تو عرب و عجم کو فتح کرنے کے خیال سے لشکر لیکر روانہ ہوا، جب بحرین پہنچا تو حمیری اور دوسرے قبائل کے لوگوں نے آگے جانے سے انکار کردیا، اور حسان کے بھائی عمرو سے کہا کہ وہ حسان کو قتل کردے تو وہ اس کو بادشاہ بنادیں گے، عمرو اس کے لیے تیار ہوگیا، ذو رعین نے اس کو اس فعل سے منع کیا مگر وہ نہ مانا تو وہ ذو رعین نے

[1] دیوان شماخ (قاہرہ) ص ۲۶ شعر ۲ [2] مفضلیات [3] شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ج ۱ ص ۱۱

مندرجہ ذیل دو اشعار کہے:

الا من یشتری سہرا بنوم سعید من یبیت قریر عین

فلما حمیر غدرت وخانت فمعذرۃ الالٰہ لذی رعین

اور اس نے ان کو ایک رقعہ میں لکھکر مہر کر دیا اور اسے عمرو کے پاس امانۃً رکھدیا۔ یہ ایک ایسی تحریری امانت تھی جس سے وہ آخرکار اپنی جان کی امان پاسکا[1]۔

گرخط وکتابت کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ عرب میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا، اور کتابوں کی تصنیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانے سے تقریباً ۱۴۳ھ سے ہوا، لیکن قدیم روایتوں کے مطابق خط کی ایجاد اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ابن ندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ عربی خط کے موجدوں کے نام ابو جاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص اور قریشات تھے، مگر کعب کے قول کے مطابق عربی خط کی ایجاد حضرت آدمؑ نے کی تھی، بلاذری فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ قبیلہ طے کے تین اشخاص مرار بن مرہ[2]، اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ ایک مرتبہ بکہ میں اکٹھا ہوئے اور غور و فکر کے بعد خط عربی ایجاد کیا اور سریانی حروف سے عربی حروف کا مقابلہ کیا، حیرہ کے باشندوں نے عربی تحریر انبار کے لوگوں سے سیکھی، دومۃ الجندل کا حاکم بشر بن عبدالملک ایک مرتبہ حیرہ آیا اور یہاں کے باشندوں سے عربی تحریر سیکھی، یہاں سے مکہ گیا، یہاں سفیان بن امیہ اور ابو قیس بن عبد مناف نے اس کو عربی لکھتے ہوئے دیکھا تو اس کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی، بشر نے انھیں لکھنے کے طریقے بتائے، اس کے بعد بشر، سفیان اور قیس تینوں تجارتی سلسلے میں طائف گئے، یہاں غیلان نے ان سے عربی تحریر سیکھی، بشر طائف سے مصر گیا اور یہاں اس نے عمرو بن زرارا کو عربی تحریر کی تعلیم دی، جو عمرو المنشی کے نام سے

[1] السیرۃ النبویہ لابن ہشام الحمیری (بتحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ) ج ۱ ص ۲۰ - ۲۹ [2] امیر علی نے اپنی کتاب مسلمانوں کی ایک مختصر تاریخ (A short history of Saracens) ص ۲۶۹ میں عربی خط کی ایجاد حیرہ کے قریب انبار کے رہنے والے امرار بن مرہ سے منسوب کی ہے۔

مشہور ہوا، اس کے بعد شام کے لوگوں نے بھی بشر سے لکھنا پڑھنا سیکھا[1]،

اسلام سے کچھ پہلے اوس وخزرج کے چند آدمی اور یہودی لکھنا جانتے تھے اور لڑکے ان سے فن تحریر کی تحصیل کیا کرتے تھے، بعثت نبوی کے بعد لوگوں میں عربی تحریر عام ہوگئی[2]،

ہرحال عربی تحریر کا موجد کوئی بھی ہو مگر یہ مسلّم ہے کہ عربی اسلام سے پہلے لکھی جاتی تھی اور اسلام کے بعد بتدریج اس کی ترقی ہوتی رہی، قبل اسلام کا عربی کا تحریری سرمایہ شعروں اور سیاسی و تجارتی معاہدوں پر مشتمل تھا، اسلام کے ظہور کے بعد جب ہر چیز تیزی سے بدلنے لگی اور اسلامی عقائد و اصول کی اشاعت ہونے لگی تو اسلامی ادب عربی تحریر کا موضوع بن گیا، اس دور کے تحریری ادب میں قرآن، حدیث، سیرت اور مغازی خاص اصناف ہیں، اور اس دور کی تحریری ترقی کے اندازہ کے لیے ان پر سرسری روشنی ڈالی جائے گی،

بعثت نبوی کے بعد قرآن شریف سب سے بڑا تحریری سرمایہ ہے، چالیس سال کی عمر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی تھی، آپ اُمّی تھے، وحی الٰہی کو خود تحریر میں نہیں لاسکتے تھے، اس لیے کتابت وحی کے لیے آپ نے مختلف صحابہ کو مقرر کیا، پہلے زید بن ثابت وحی لکھتے تھے، پھر ابی بن کعب مقرر ہوئے، حضرت معاویہؓ نے بھی یہ خدمت انجام دی[3]، سب کاتب برابر وحی کی کتابت کرتے تھے، اس لیے ہر کاتب کے پاس قرآن مجید کا نسخہ تیار ہوتا رہا، آگے چل کر ان اصل نسخوں سے متعدد دوسرے نسخے تیار کیے گئے، جن سے دور دراز کے مسلمانوں میں تعلیم قرآن کی اشاعت ہوئی،

کاتبان وحی میں زید بن ثابت، ابی بن کعب، معاویہ بن ابی سفیان اور عبداللہ بن مسعود زیادہ مشہور ہیں، لیکن مختلف روایتوں کے مطابق کاتبان وحی کی فہرست بہت طویل ہے، ان میں

[1] یحیٰ بن یحیٰ البلاذری: فتوح البلدان ص ۴۷۱ - ۴۷۳، [2] ایضاً ص ۴۷۳ - ۴۷۴، [3] فتوح البلدان

بیالیس[۳۷] کاتبوں کے نام ملتے ہیں، محدث ابن سید الناس کے بیان کے مطابق اڑتیس[۳۸] کاتب وحی تھے،[1]

عہد نبوی میں کتابت وحی باضابطہ فن بن گئی تھی، وحی کے نزول کے فوراً بعد آپ کسی کاتب کو بلا کر اس کو لکھوا دیتے تھے،[2] بعض شواہد ایسے موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم متعدد کاتبوں کو فرداً فرداً وحی لکھوا دیتے تھے،[3] اس طرح ان سب کے پاس قرآن مجید کا ایک ذاتی نسخہ تیار ہو گیا تھا، ان میں سے بعض نسخوں کا ذکر حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ کی کتابوں سے ملتا ہے،

صحیح بخاری و مسلم کی روایات کے مطابق حضرت معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، ابی بن کعبؓ اور ابو زید کے پاس قرآن شریف کے نسخے تھے،[4] ان کے علاوہ ایک نسخہ سعد بن عبید[5] اور ایک عقبہ بن عامر الجہنی[6] کے پاس بھی تھا، ابن الندیم کے بیان کے مطابق ایک نسخہ حضرت حفصہؓ کے پاس تھا، جس کو حضرت زید بن ثابتؓ کی ادارت میں مختلف نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد مرتب کیا گیا تھا،[7] ان کے علاوہ ابن سعد کے بیان کے مطابق حضرت ابو الدرداءؓ، عثمان بن عفانؓ، تمیم داری، عبادہ بن الصامتؓ، ابو ایوب انصاریؓ، علی ابن ابی طالبؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ نے بھی کتابت وحی کی خدمت انجام دی تھی، اس لیے ان لوگوں کے پاس بھی قرآن شریف کے نسخے تھے،[8] ابن الندیم کے بیان کے مطابق حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بھی قرآن کا وہ نسخہ تھا جس کو زید بن ثابتؓ نے جنگ یمامہ کے بعد مرتب کیا تھا،[9]

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ کاتبان وحی کی تعداد بیالیس[۴۲] تک تھی، اس لیے قیاس ہے، کہ ہر کاتب کے پاس ایک ایک نسخہ ضرور رہا ہوگا، اس طرح عہد نبی میں بیالیس[۴۲] نسخوں کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ قرآن مجید کی تعلیم کی توسیع و اشاعت کے لیے اس کی نقلیں مختلف مقامات میں بھیجی

[1] عیون الاثر ج ۲ ص ۳۱۵-۳۱۶ [2] جامع الترمذی ج ۲ ص ۱۳۴ [3] صحیح بخاری (طبع مصر) ج ۳ ص ۷۶، دارمی [4] ایضاً ص ۴۳، ۲۳ و صحیح المسلم (طبع مصر) ج ۳ ص ۲۵۲ [5] استیعاب ج ۲ ص ۵۷۵ [6] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۴۳ [7] الفہرست (بتحقیق G. Fluegel) ص ۲۴ [8] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۱۲ [9] الفہرست ص ۲۴

جاتی تھیں، موطا امام مالک اور سنن ابی داؤد کی بعض روایتوں سے قیاس ہوتا ہے کہ قرآن کے بکثرت نسخے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے، عورتیں بھی لکھنا جانتی تھیں، ان میں ام کلثومؓ، حضرت عائشہؓ، کریمہ اور شفاء بنت عبد اللہؓ مشہور ہیں،

مندرجہ بالا شواہد سے یہ صاف ظاہر ہے کہ عہد نبوی میں تحریر کا رواج عام تھا، اس کا ثبوت کلام مجید سے بھی ملتا ہے، مثلاً کلام مجید میں حکم ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ (البقرہ - ۲۸۲)

اے ایمان والو جب تم ایک خاص مدت تک کے لیے دو آدمیوں کے درمیان لین دین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو

یہ اس کا ثبوت ہے کہ اس وقت عرب میں لکھنے پڑھنے کا دستور تھا،

طبقات ابن سعد میں ہے کہ غزوۂ بدر میں قریش کے بہت سے لوگ گرفتار ہو گئے تھے، جو اہل ثروت تھے وہ تو فدیہ ادا کر کے رہا ہو گئے، مگر جو لوگ نادار تھے اور فدیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، ان سے کہا گیا کہ ان میں سے ہر ایک شخص دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے،[1]

صحیح مسلم اور فتوح البلدان میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ کسی مکتوب کو اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک اس پر مہر نہ لگی ہو، چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی،[2]

جس طرح وحی کی کتابت اور اس کی تدوین عہد نبوی میں انجام پائی اسی طرح صحابۂ کرام نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں اور آپ کے افعال و اقوال کو بڑے ذوق و شوق اور محنت سے جمع کیا، چنانچہ صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں بعض صحابہ

[1] طبقات ابن سعد، غزوۂ بدر، ص ۱۴؛ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۲ [2] صحیح المسلم ج ۲ ص ۱۵۰؛ فتوح البلدان

آپ کی اجازت سے آپ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے، صحیح بخاری باب العلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں یاد نہیں، صرف عبد اللہ بن عمروؓ مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ جو کچھ سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے،[1] خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں اور ابن الاثیر نے اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبد اللہ بن عمروؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں قلمبند کرتے تھے، 'صادقہ' تھا، اس میں انھوں نے ایک ہزار حدیثیں جمع کی تھیں،[2]

ایک مرتبہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت اسلام لا چکے ہیں ان کے ناموں کی فہرست تیار کیجائے، چنانچہ پندرہ سو صحابہ کے نام رجسٹر میں درج کیے گئے،[3] تقیید العلم میں ایک دوسری روایت ہے کہ جب حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لیے زیادہ لوگ جمع ہو جاتے تو وہ ایک جنگ نکال لاتے اور کہتے تھے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنکر لکھی تھیں۔

اسماء الرجال کی کتابوں میں ایسے بہت سے صحابہ کا ذکر آتا ہے جو اپنے پیغمبر کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے، سنن ترمذی کی روایت ہے کہ ایک انصاری کا حافظہ بہت کمزور تھا، انھوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ وہ حدیثوں کو لکھ لیا کریں،[4] اسی طرح ابو رافعؓ نے بھی حدیثوں کو قلمبند کرنے کی اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، فتح مکہ کے سال ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا، اس واقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص ابو شاہ نے یہ خطبہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ خطبہ اس کے لیے لکھوا دیا جائے، چنانچہ اس کو لکھ کر دیدیا گیا،[5] بہت سے صحابۂ کرام

[1] طبقات ابن سعد، ج ۴ حصہ ۲ ص ۹ [2] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۳۲-۲۳۵، سیرۃ النبی ج اول [3] سیرۃ النبی ج ۱ [4] جامع الترمذی ج ۲ ص ۹۱ [5] بخاری: جامع الصحیح کتاب العلم، باب الکتابت؛ فتح الباری ۱۴۵

بعض بعض حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے بعض نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں اور آپکے ارشادات کو کتابی شکل میں جمع کیا تھا، عہد نبوی میں حدیث کے جو مجموعے مرتب کیے گئے وہ صحیفہ کہلاتے تھے، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے اپنی کتاب ادب حدیث (Hadith Literature) میں اور گولڈ زیہر نے اپنی کتاب اسلامی مطالعات (محمڈینشے اسٹوڈین) میں مختلف صحابۂ کرام کے صحیفوں کا ذکر کیا ہے جو ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک صحیفہ مرتب کیا تھا جو ان کے شاگرد ہمام بن منبہ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے، ہمام بن منبہ کے اس صحیفہ کو ڈاکٹر حمید اللہ نے تحقیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے، حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جو فقہ کے مسائل پر مشتمل تھا،[1] سمرہ بن جندب نے ایک صحیفہ مرتب کیا تھا، اور ان کے صاحبزادے نے بھی حدیثوں پر مشتمل ایک رسالہ لکھا تھا،[2] جابر بن عبد اللہ کے صحیفہ سے بعد میں قتادہ نے حدیثیں روایت کی ہیں،[3] حضرت سعدؓ نے بھی ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت سے متعلق حدیثیں ہیں،[4] عبد اللہ بن ابی اوفیٰؓ کے پاس ایک کتاب تھی جس کی ایک حدیث کا ذکر بخاری نے اپنی صحیح میں کیا ہے،[5] حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پانچ سو احادیث جمع کی تھیں، جن کو بعد میں تلف کر دیا،[6] حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے ابو رافع نے جو حدیثیں سنی تھیں ان کو ایک کتاب کی صورت میں لکھ لیا تھا،[7] قیاس ہے کہ عبد اللہ بن عباسؓ نے کئی کتابیں لکھی تھیں، ترمذی نے کتاب العلل میں روایت کی ہے کہ ایک شخص طائف سے عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک کتاب لایا، اور وہ کتاب ان کو پڑھکر سنائی،[8] ابن عبد البر کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباسؓ نے اپنے بعد ایک بار شتر کے بقدر اپنی مرتب کتابیں چھوڑیں جن سے ان کے لڑکے علی نے استفادہ کیا۔[9]

[1] جامع الصحیح، کتاب العلم، باب الکتابت، ج ۱ ص ۲۱ [2] جامع الترمذی (الیمین مع الشاہد) ج ۱ ص ۱۹۰ [3] گولڈ زیہر Muhammadanische Studien ج ۲ ص ۱۰ [4] ایضاً ج ۲ ص ۱۰ [5] ایضاً ج ۲ ص ۱۰

[6] تذکرۃ الحفاظ (حیدر آباد) ج ۱ ص ۵ [7] طبقات ابن سعد ج ۲ حصہ ۲ ص ۱۲۳ [8] جامع الترمذی ص ۲۳۸

[9] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۶

ان صحیفوں کے علاوہ اور بہت صحیفے ضائع ہو گئے ہوں گے جن کے بارے میں ہم کو کوئی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، بہرحال جن صحیفوں کا یہاں ذکر ہوا ہے، تنہا وہی عہد نبوی میں تحریری ترقی کے ثبوت کے لیے کافی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے عہد میں جو خطوط اور ہدایت نامے جاری کیے ہیں وہ عربی ادب میں بہت اہم ہیں، ان سے اس دور کے عربی ادب اور عربی تحریر کی تاریخ دونوں پر روشنی پڑتی ہے، انھوں نے پینتالیس (۴۵) غیر معمولی سرکاری خطوط لکھے تھے، جو حالات پر تبصرے، حاکموں اور سپاہیوں کو مفید مشوروں اور خدا کے احکام و رسولؐ کے ارشادات پر مشتمل ہیں،[1]

حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے اپنے عہد خلافت میں مختلف اہم تحریری احکام اور ہدایتیں جاری کی تھیں، حضرت عمرؓ نے حدیثوں کی تعلیم و اشاعت کی بھی نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں، ان سب سے عربی ادب کے تحریری سرمایہ میں اضافہ ہوا،

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں تحریر و کتابت کا عام رواج اور لکھنے پڑھنے کی باضابطہ تعلیم کے ساتھ تدوین و تالیف کا بھی آغاز ہو گیا تھا، لیکن تالیف و تصنیف کا سلسلہ صحیح معنوں میں بنی امیہ کے دور میں شروع ہوا، اور عباسی دور میں اپنے عروج کو پہنچا، جب امیہ برسر اقتدار آئے تو انھوں نے اس اہم ضرورت کو محسوس کیا، اور علماء و فضلاء کو تصنیف و تالیف پر آمادہ کیا، اس سے پہلے وہ اس کو فعل عبث سمجھتے تھے،[2]

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں عبید بن شریہ پہلے مورخ ہیں جنھوں نے قدماء کی مفصل تاریخ مرتب کی اور اس کا نام اخبار الماضیین رکھا، عبدالملک بن مروان ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، وہ بڑا عالم تھا، اس نے علماء سے ہر فن میں کتابیں لکھوائیں، حضرت سعید بن جبیرؓ کو تفسیر لکھنے کا حکم دیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

[1] مجلہ برہان، دہلی کے جنوری ۱۹۵۱ء سے فروری ۱۹۵۲ء تک جناب فاروق صاحب نے "ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط" کے عنوان سے مسلسل مضمون لکھا ہے، خطوط کی نقلوں کے ساتھ تشریحی تفصیل بھی ہے۔ [2] کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرھنا علیہ ھؤلاء الامراء (ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے مگر امراء نے ہم کو اس پر مجبور کیا)

نے اسلامی ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبوی مدون اور قلمبند کی جائیں، چنانچہ سعد بن ابراہیم نے حدیثوں کے بڑے بڑے دفتر جمع کیے اور اس کے بہت سے نسخے تیار کرکے تمام اسلامی ملکوں میں بھیجے گئے، ابوبکر ابن عمرو بن حزم الانصاری نے جو بلند پایہ محدث اور امام زہری کے استاذ تھے، حدیثوں کو قلمبند کیا، مختلف مسائل میں حضرت عائشہؓ کی حدیثیں بہت مستند سمجھی جاتی تھیں، اس لیے عمر بن عبدالعزیزؒ نے عمرہ بنت عبدالرحمن سے جو حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ اور بڑی محدثہ تھیں، ان حدیثوں کو مرتب کرایا،

فن مغازی پر بہت سی تالیفات لکھی گئیں، امام زہری نے جو اس فن کے امام تھے، ایک مستقل کتاب لکھی، ان کے تلامذہ میں یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمن بن عبدالعزیز، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق نے اس فن میں خاص شہرت حاصل کی، ان میں موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق استاد ہی کی طرح فن مغازی کے امام سمجھے جاتے تھے، اور ان کی کتابیں بہت معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہیں،

عروہ بن زبیر حضرت زبیرؓ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ فن مغازی میں سب سے پہلی کتاب انھی نے لکھی تھی، امام شعبی بھی بڑے پایہ کے محدث تھے، ان کے علاوہ اموی دور میں وہب بن منبہ، عاصم بن عمر بن قتادہ الانصاری، محمد بن مسلم بن شہاب الزہری، یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس بن شریق الثقفی اور ہشام بن عروہ بن زبیر فن سیرت کی تدوین و تالیف میں مشہور ہیں،[1]

ابو قلابہ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، مکحول نے تحصیل علم کے لیے مصر و شام اور مدینہ کے سفر کیے اور سنن پر ایک کتاب لکھی،[2] ان کے علاوہ بہت سے علماء و محدثین اور مصنفین نے اسلامی ملکوں میں علم کی روشنی پھیلائی، عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج مکہ میں، سعید بن عروبہ دمشق اور کوفہ میں، الاوزاعی شام میں، محمد بن عبدالرحمن مدینہ میں، زائدہ بن قدامہ اور سفیان الثوری کوفہ میں اور حماد بن سلامہ

[1] شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۷-۱۹ [2] الفہرست ص ۲۲۵-۲۲۶

بصرہ میں علوم و فنون کی شمعوں سے دنیائے اسلام کو بقعۂ نور بنا رہے تھے،[۱]

نثری تصنیف کے علاوہ اس زمانہ میں شعر کی تدوین کو بھی ترقی ہوئی، اور وہ سینوں سے سفینوں میں منتقل ہو گیا، اخطل اس دور کا مشہور شاعر تھا، اس کا مجموعۂ کلام اسی زمانہ میں مدون ہو گیا تھا،

ایک مشہور شاعرہ لیلی الاخیلیہ اور قبیلۂ جعدہ کے ایک شاعر نابغہ میں شاعرانہ چشمک تھی، لیلی نے نابغہ کے قبیلہ کی ہجو کی، اس پر قبیلہ کے لوگ برہم ہو گئے، اور خلیفۂ وقت (غالباً خلیفہ سے مراد حضرت عمرؓ ہیں) سے شکایت کی، لیلی کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے یہ اشعار کہے:

انانی من الانباء ان عشیرۃ   بشور ان یزجون المطی المذللا

یروح ویغدو وفدھم بصحیفۃ   لیستجلدا الی ساء ذلك معملا[۲]

مجھے خبر ملی ہے کہ شور ان کے قبیلہ کے لوگ اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر جا رہے ہیں اور صبح و شام کی منزلیں کرتے جاتے ہیں، ان کے پاس ایک نوشتہ بیاض ہے جس سے وہ مجھے سزا دلوانا چاہتے ہیں، یہ کتنا خراب کام ہے[۳]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قبیلہ جعدہ کے لوگ اپنے ساتھ وہ تمام معترضہ قصیدے جو کتاب الاغانی میں مذکور ہیں تحریری صورت میں لے گئے تھے۔

ایک مرتبہ بحتری نے ایک قصیدہ لکھ کر ایک بزم ادب میں پڑھا، شاعر عقیلہ بن ہبیرۃ الاسدی[۴] نے جو امیر معاویہؓ کے زمانے تک زندہ تھا، خلیفہ کو اپنے اشعار لکھ کر دیے، شاعر ذو الرمہ نے ایک مجلس میں اپنی ایک نظم پڑھی، اور سامعین سے کہا کہ وہ اس نظم کو لکھ لیں، کیونکہ "ایک کتاب یا لکھی ہوئی تحریر کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ایسے الفاظ اور محاورے جن کو نظم کرنے میں ایک مدت لگی ہے، بدلے جا سکتے ہیں،[۵]

۱؎ الفہرست ص ۲۲۵-۲۲۶ ۲؎ کتاب الاغانی ج ۴ ص ۱۳۲ ۳؎ خزانہ ج ۱ ص ۳۴۳

۴؎ نقائض ص ۲۰۰ شعر ۱۸

اخطل کے پاس لبید کا دیوان موجود تھا،[۱] اخطل کمہار تھا، اور مٹی کے برتن بنانے کے دوران اپنے اشعار ان برتنوں پر نقش کرتا جاتا تھا، اور جب کوئی اس سے اس کے اشعار مانگتا تو وہ ٹھیکروں پر لکھ کر دیدیا کرتا تھا،

بحتری نے خلیفہ معتز کی مدح میں چند اشعار لکھے تھے،[۲] مگر معتز اس وقت قید میں تھا، اس نے وہ رقعہ لے لیا جس میں اشعار لکھے ہوئے تھے، اور رہائی کے بعد چھ اشعار کے بدلے بحتری کو چھ ہزار دینار عطا کیے[۳]

ان واقعات سے اموی دور میں نظم و نثر کی کتابت پر روشنی پڑتی ہے، ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایات کے خزانے اس کے کتب خانہ سے منتقل ہوئے تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں،[۴] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں دوسرے مؤلفین اور مصنفین کی تالیفات اور شعری مجموعوں کا کتنا بڑا ذخیرہ رہا ہوگا۔

۱؎ نقائض ص ۲۰۰ شعر ۱۸ ۲؎ یہ اشعار دراصل محمد بن یوسف الثغری کے لیے بحتری نے کہے تھے، الثغری بھی اس وقت مقید تھا، مگر بعد میں یہ شعر معتز سے منسوب کر دیے گئے ۳؎ کتاب الاغانی ج ۵ ص ۱۸۹-۱۹۰

۴؎ طبقات ابن سعد ج ۲ حصہ ۲ ص ۱۳۶؛ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۴

دینور اور مشائخ دینور

از جناب سید شمیم احمد صاحب، ڈھاکہ

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کے بعد صوفیائے کرام کا جو طبقہ ظہور میں آیا اُن میں خواجہ ممشاد علو دینوری کا نام بڑا محترم ہے، وہ اپنے وقت کے مشائخ کبار میں تھے، اور عرفان و معرفت کی تمام منزلیں طے کر چکے تھے، سید الطائفہ کے خلفاء میں خواجہ ابو محمد رویم، حضرت امام شبلی، خواجہ ابو علی رودباری اور خواجہ ممشاد دینوری کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، تمام تذکروں میں حضرت ممشاد کا نام نہایت عقیدت و احترام سے لیا گیا ہے، حضرت فریدالدین عطار فرماتے ہیں کہ

"آں ستودۂ رجال آں، بودۂ جلال صاحب دولت زمانہ آں عالی ہمت یگانہ آں مجردہ شدہ از کینہ وری شیخ وقت ممشاد دینوری رحمۃ اللہ پیر عہد بود و یگانۂ روزگار و برگزیدہ بہمہ کمال و خصال[1] ......"

نویں صدی ہجری کے اوائل میں سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگوں کا ایک تذکرہ "مناقب الاصفیا"[2] لکھا گیا ہے، اس میں حضرت ممشاد علو دینوری کو سید الطائفہ کا خلیفہ بتایا گیا ہے، خواجہ عطار کی طرح

[1] تذکرۃ الاولیا (مطبع محمدی بمبئی) ص ۲۰۳ [2] یہ کتاب نویں صدی ہجری کے پہلے نصف اول میں بہار کے کسی بزرگ نے لکھی تھی، یوں وہ مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری کے چچازاد بھائی مخدوم شاہ شعیب سے منسوب ہے، لیکن یہ غلط ہے، اس سلسلہ میں راقم الحروف کا ایک مضمون معارف کے شمارہ مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہو چکا ہے، یہ فردوسیہ خانوادے کے بزرگوں کی تاریخ ہے۔ حال ہی میں اس کا اردو ترجمہ بہار شریف (پٹنہ) سے شائع ہوا ہے۔

صاحب مناقب الاصفیا نے بھی نہایت ادب و احترام سے حضرت ممشاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ عارف تھے، عرفان کی منزلوں سے گذر چکے تھے، صدق و صفا کے مرحلوں کی سختیاں جھیل چکے تھے، میدانِ طریقت کے سیاح تھے، بحر حقیقت کے غواص، عارفوں میں محترم و مکرم اور احسان والوں میں محتشم، عشق و محبت کی دیوانگی میں پیش رو، علم و عرفان میں عظیم الشان، میدان مجاہدہ کے شہسوار، مقاماتِ مشاہدہ کے سربراہ، سقطی و ثوری کے مسلک پر گامزن تھے"[1] تذکرۃ الاولیاء اور مناقب الاصفیا میں آپ کا ذکر کافی تفصیل کے ساتھ ہے، نفحات الانس مولانا عبدالرحمٰن جامی اور سفینۃ الاولیاء دارا شکوہ میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، مگر احترام و ادب میں فرق نہیں ہے، حضرت ممشاد کا نام کئی خانوادوں میں آتا ہے، سہروردیہ اور فردوسیہ میں خواجہ جنید بغدادی کے توسط سے چشتیہ میں خواجہ ہبیرہ بصری کے ذریعہ آپ کو خلافت پہنچی، سہروردیہ اور فردوسیہ سلسلہ خواجہ ممشاد کے بعد تین واسطوں یعنی خواجہ احمد اسود دینوری، خواجہ ابو محمد عمویہ اور خواجہ ابو نجیب ابو القاہر سہروردی تک ایک ہے، اس کے بعد شیخ الشیوخ خواجہ شہاب الدین سہروردی سے جو سلسلہ جاری ہوا وہ سہروردیہ کہلایا، اور شیخ نجم الدین کبریٰ سے جاری ہونے والے خانوادے نے دو واسطوں کے بعد فردوسیہ کا نام اختیار کیا، خواجہ جنید بغدادی اور خواجہ ہبیرہ بصری کے علاوہ حضرت ممشاد کا ایک سلسلہ شیخ کبیر خواجہ عبداللہ خفیف سے بھی ہے، اس سلسلہ کا ذکر شیخ عبدالرحیم بن شیخ بینا چشتی نے اپنی تصنیف سیر الاقطاب[2] میں کیا ہے، یعنی خواجہ ممشاد کو خواجہ عبداللہ خفیف سے خلافت حاصل تھی، اور انھیں خواجہ ابو محمد رویم جو سید الطائفہ کے خلیفہ اعظم ہیں، غرض حضرت ممشاد سلاسل طریقت میں بڑی اہم اور ہمہ گیر حیثیت کے مالک ہیں، مناقب الاصفیاء میں ممشاد کا تلفظ "پہلی میم کے زیر اور دوسری میم کے جزم"[3]

[1] مناقب الاصفیاء ص ۱۹ (اردو) [2] سیر الاقطاب ص ۵۰ [3] مناقب الاصفیاء (اردو) ص ۱۹

ساقط کیا گیا ہے، حضرت فرید الدین عطار نے وصال کا سال ۲۹۹ھ لکھا ہے[1]، مناقب الاصفیا، نفحات الانس اور سفینۃ الاولیا نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

حضرت ممشاد علم ظاہر و باطن دونوں سے آراستہ تھے، بڑی محنت و ریاضت سے کمال حاصل کیا تھا، بغداد کے تمام مشائخ آپ کی اقتدا کرتے تھے، توحید اور عشق الٰہی میں غرق تھے، اس سلسلہ میں آپ کے بہت سے کلمات طیبات ہیں، آپ کے وصال کے وقت ایک مرید نے دعا کی بار الٰہا میرے پیر خواجہ ممشاد کی مغفرت فرما، اور جنت الفردوس میں جگہ دے، آپ نے فوراً آنکھ کھول دی اور غضبناک لہجہ میں فرمایا، کیا خرافات بک رہے ہو، تیس برس سے برابر کہا جا رہا ہے کہ یہ دیکھو بہشت ہے، مگر ہم آنکھ اٹھا کر بھی ادھر نہیں دیکھتے، یہ بھی کوئی دعا میں دعا ہے، مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری اس واقعہ کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ "اللہ اکبر کیا شان تھی، حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات حقیقی متقی ہیں، پاک عالم سے آئے اور پاک عالم میں جائیں گے، کون عالم جس کا نام صدق ہے، اس حالت میں بہشت و دوزخ کا ذکر کس شمار میں آسکتا ہے، یہ خاص مقام کی بات ہے"[2] نزع کی حالت میں کسی نے حضرت ممشاد سے پوچھا، اس وقت دل کا کیا حال ہے، فرمایا تیس سال ہو چکے دل کھو چکا ہے، بہت تلاش کیا نہیں ملا، تمام کائنات اور خود اپنی ہستی ذات واحد کے مطالعہ میں گم کر دی، ایک مرید نے سوال کیا، بیماری سے آپ کا کیا حال ہے، فرمایا، بیماری کے بارے میں مجھ سے نہ پوچھو، خود بیماری سے میرے بارے میں پوچھو

علو دینوری ایک اہم سوال یہ ہے کہ حضرت ممشاد دینوری اور حضرت علو دینوری ایک ہیں، یا دو جداگانہ شخصیتیں ہیں، تذکرہ نگاروں کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔

---

[1] تذکرۃ الاولیا، ص ۵۳۹ (طبع محمد علی ممبئی)، نفحات الانس ص ۱۰۳۔ مناقب الاصفیا ص ۲۰۰ (اردو) سفینۃ الاولیا ص ۱۴۸
[2] مکتوبات صدی، مکتوب ۲۷ – ۱۵۱

ایک طبقہ دونوں کو دو الگ الگ شخصیتیں مانتا ہے، دوسرا دونوں کو ایک ہی مانتا ہے، شجروں اور تذکروں میں کہیں صرف ممشاد ہے، اور کہیں ممشاد علو دینوری، ایک دلچسپ روایت یہ بھی ہے کہ دونوں دو بزرگ تھے، مگر آپس میں بہت اتحاد و ارتباط تھا، دونوں کا ایک ہی دن انتقال ہوا اور ایک ہی قبر میں دفن بھی کیے گئے، تذکرۃ الاولیا، میں صرف ممشاد دینوری کا ذکر ہے، علو دینوری یا کسی اور دینوری بزرگ کا ذکر نہیں، نفحات الانس میں بھی صرف ممشاد دینوری کے نام سے ایک باب ہے، علو دینوری کا کوئی ذکر نہیں، حالانکہ متعدد دوسرے دینوری مشائخ کے حالات ہیں، مخدوم الملک نے بھی مکتوبات صدی کے ۲۷ ویں مکتوب میں صرف ممشاد دینوری ہی لکھا ہے[1]، مناقب الاصفیا، میں خواجہ ممشاد علو دینوری کے نام سے ایک باب ہے، جس میں کہیں صرف ممشاد دینوری لکھا گیا ہے، اور کہیں ممشاد علو دینوری، قیاس ہے کہ پورا نام ممشاد علو دینوری ہوگا، جن لوگوں نے اختصار سے کام لیا انھوں نے صرف ممشاد ہی لکھا، اگر واقعی حضرت ممشاد اور حضرت علو دو ہوتے تو تذکرۃ الاولیا، یا نفحات الانس میں علو دینوری کا بھی ذکر ہوتا، مذکورۂ بالا تذکروں کے برعکس دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا، میں دو الگ شخصیتیں مانا ہے، حضرت ممشاد کا ذکر سہروردیہ خانوادہ کے شیخ کی حیثیت سے کیا ہے، اور حضرت علو دینوری کو چشتیہ سلسلہ کا بزرگ اور حضرت ہبیرہ بصری کا مرید لکھا ہے، لیکن دونوں کا سال وفات ۲۹۹ھ لکھا ہے، اور اس اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے کہ "تذکرۃ الاصفیا، اور مشائخ چشت کے بعض شجرات میں درج ہے کہ شیخ علی دینوری اور شیخ ممشاد دینوری دونوں ایک ہیں، جن کو لوگ شیخ ممشاد علو دینوری لکھتے ہیں، لیکن نفحات الانس اور بعض دوسری کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کی دو شخصیتیں ہیں، شیخ ممشاد کا ذکر سہروردیہ سلسلہ میں کیا جائے گا"[2]۔

---

[1] مکتوبات صدی (اردو ترجمہ، شاہ نجم الدین بہاری مطبوعہ کراچی) ص ۱۵۱ [2] سفینۃ الاولیا (فارسی) ص ۱۵۱ اردو کراچی ص ۱۲۳

لیکن دارا شکوہ کو غلط فہمی ہوئی ہے، نفحات الانس میں کوئی ایسا بیان نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ مولانا جامی نے حضرت ممشاد اور حضرت علو کو دو شخصیتیں سمجھا ہے، نفحات میں صرف ممشاد دینوری کا ذکر ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا جامی دونوں کو ایک ہی شخص سمجھتے تھے، محض اختصار کے لیے پورا نام ممشاد علو کی بجائے صرف ممشاد لکھا ہے، ورنہ جہاں انھوں نے مشائخ دینور کا ذکر کیا ہے حضرت علو کا نام کیوں چھوڑتے، خزینۃ الاصفیا میں ممشاد دینوری اور علو دینوری کے نام سے دو الگ الگ باب ہیں، حضرت علو کو حضرت جنید، رویم اور نوری کا معاصر بتایا گیا ہے، اور اس سند کا بھی ذکر کیا ہے جس کو سیر الاقطاب میں خواجہ عبد اللہ خفیف کے توسط سے تحریر کیا ہے، صاحب خزینۃ الاصفیا[1] نے دارا شکوہ کے اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "شاید دارا شکوہ کا قول صحیح ہو، مگر چونکہ انھوں نے دونوں کا سال وفات ۲۹۹ھ لکھا ہے، اس لیے شک ہوتا ہے کہ شاید ممشاد علو دینوری ہی ہیں، جن کا ذکر دونوں خانوادوں میں کیا گیا ہے"[2]

مولانا معین الدین اجمیری نے اپنی تالیف نثار خواجہ میں خواجہ عثمان ہارونی کا جو شجرہ درج کیا ہے اس میں ممشاد علو دینوری ہے، مولانا حکیم شاہ شعیب پھلواروی نے اعیان وطن میں بجا ارشاد فرمایا ہے کہ "کبھی یہ بات قابل تسلیم ہو سکتی ہے کہ دو شخص ایک ہی نام کے ایک ہی تاریخ اور ایک ہی سنہ میں انتقال کرے اور اسی دن ایک ہی قبر میں دفن بھی ہو"[3]۔ ان بیانات کو سامنے رکھنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ممشاد علو دینوری ایک شخص ہیں، سلسلہ چشتیہ میں خواجہ ہبیرہ بصری کے توسط اور سہروردیہ و فردوسیہ میں خواجہ جنید بغدادی کے توسط سے ان کا نام آتا ہے، ان دونوں کے علاوہ ان کو خواجہ عبد اللہ خفیف سے بھی خلافت حاصل تھی، یوں زیادہ شہرت جنیدی نسبت سے ہوئی، جو حضرت جنیدؒ کی عظمت کا نتیجہ ہے۔

---

[1] خزینۃ الاصفیا ص ۲۴۰ [2] ایضاً [3] اعیان وطن ص ۱۶۴

دینور کہاں ہے؟ یہ تو طے شدہ ہے کہ دینور کسی جگہ کا نام ہے، تحقیق طلب یہ ہے کہ یہ مقام کہاں ہے، مناقب الاصفیا، نفحات الانس اور سفینۃ الاولیا میں حضرت ممشاد اور دوسرے مشائخ دینور کے حالات پڑھنے سے اس میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ جن بزرگوں کے ناموں کے ساتھ دینوری آتا ہے، ان کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے دینور سے تھا، خواہ وہ خود وہاں کے باشندے ہوں یا وہ ان کے آبا و اجداد کا وطن رہا ہو، یا پھر انھوں نے دینور میں سکونت اختیار کر لی ہو، تذکرۃ الاولیا میں حضرت ممشاد کے علاوہ دینور کے کسی دوسرے شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے، حضرت ممشاد کے ذکر میں بھی دینوری کی وجہ تسمیہ ظاہر نہیں کی گئی ہے، لیکن مناقب الاصفیا، میں جہاں لفظ ممشاد کا تلفظ بیان کیا گیا ہے، یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ دینور ان کے جائے سکونت کا نام ہے[1] اسی کتاب میں حضرت احمد اسود دینوری کی جائے سکونت بھی دینور بیان کی گئی ہے، نفحات الانس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دینور کسی جگہ کا نام ہے، اصل بحث یہ ہے کہ دینور کہاں ہے؟ مناقب الاصفیا کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے بھی اس کی تحقیق کا مسئلہ پیدا ہوا تھا، رسالہ قشیریہ میں جہاں خواجہ احمد سیاہ دینوری کا تذکرہ ہے، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کوئی دیہات تھا یا شہر[2]

مولانا ابو صالح محمد یونس بہاری نے مناقب الاصفیاء کا جو اردو ترجمہ شائع کیا ہے، اس کے ص ۱۹۸ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "نفحات الانس کے صفحہ ۹۳ میں لکھا ہے کہ دینور ایک قریہ ہے اور کرمان کے علاقہ میں ہے"، مجھے ڈھاکہ میں نفحات کے تین اڈیشن جو مطبع لیسی کلکتہ ۱۸۵۸ء، مطبع نولکشور لکھنو اور مطبع سیدی دہلی سے شائع ہوئے ہیں، دیکھنے کا موقع ملا، مگر صفحہ ۹۳ پر کوئی ایسی وضاحت نہیں ملی، شاید کوئی اور اڈیشن ہوگا، جس کا ذکر مولانا یونس نے کیا ہے، دارا شکوہ نے حضرت ممشاد کے ذکر میں لکھا ہے کہ دینور قرمیسین کے قریب جبل کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے[3]

---

[1] مناقب الاصفیا، ص ۱۹۰ (اردو) [2] سفینۃ الاولیا، ص ۱۴۸ (اردو نفیس اکیڈمی کراچی)

لیکن یہ غلط ہے، دینور ایران اور عراق میں نہیں بلکہ سیلون میں تھا، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں جزیرہ سیلان (لنکا) کے حال میں نہایت تفصیل وتشریح کے ساتھ دینور کا ذکر کیا ہے،

ابن بطوطہ کا بیان ابن بطوطہ کو سلطان محمد تغلق نے صفر ۷۴۲ھ میں سفیر خصوصی کی حیثیت سے چین کے حکمران کے پاس بھیجا تھا، ابن بطوطہ سیاح تھا، اس لیے براہ راست چین جانے کے بجائے جنوبی ہند کے شہروں کی سیر کرتا ہوا گیا، اور وہاں سے جزائر مالدیپ پہنچا، اور لنکا میں حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ ۱۵ ربیع الاول ۷۴۵ھ کو مالدیپ کے جزیرہ ملوک سے روانہ ہوا، نویں دن لنکا کی بندرگاہ بطالہ پہنچا، یہاں سے قدم مبارک کی زیارت کے لیے غار سبیک کی طرف روانہ ہوا، اس کی زیارت کے بعد دوسرے راستے سے واپس ہوا، اور مختلف مقامات میں ہوتا ہوا دینور پہنچا، وہاں سے اس کی منزل کولمبو پر ختم ہوئی، دینور کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ "......وہاں سے چل کر ہم دو دن میں دینور[1] پہنچے، یہ شہر بہت بڑا ہے، اور سمندر کے کنارے ہے، اس میں سوداگر رہتے ہیں، ایک بت جس کا نام دینور ہے، ایک بڑے بت خانہ میں رکھا ہوا ہے، اس میں تین ہزار کے قریب برہمن اور جوگی رہتے ہیں، اور پانچ سو دیوداسیاں ہیں، جو ہر روز بت کے سامنے ناچتی اور گاتی ہیں، اس شہر کا کل محصول بت خانہ کے لیے وقف ہے، اہل بت خانہ اور مسافروں کو وہاں سے روٹی ملتی ہے، بت سونے کا بنا ہوا ہے، اور قد آدم کے برابر ہے، اس کی دونوں آنکھوں کی جگہ دو بڑے یاقوت لگے ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ ان سے رات کے وقت قندیل کی طرح روشنی پیدا ہوتی ہے، پھر ہم شہر قالی میں پہنچے، یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے، دینور سے چھ فرسنگ کے فاصلے پر ہے، اس میں ایک مسلمان ناخدا ابراہیم رہتا ہے، اس نے ہماری ضیافت کی، اس کے بعد ہم کولمبو گئے

۱؎ عجائب الاسفار (اردو ترجمہ خان بہادر مولوی محمد حسین) ج ۲ ص ۳۵۹

جانب چلے، سراندیپ میں یہ سب سے بڑا شہر ہے اور خوبصورت ہے"[1]

اس بیان سے دینور کی مندرجہ ذیل خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں:-

(۱) یہ ایک بڑا شہر تھا (۲) سمندر کے کنارے تھا یعنی اس کی حیثیت بندرگاہ کی تھی، (۳) تجارتی مرکز بھی تھا، کیونکہ تاجر رہا کرتے تھے (۴) مذہبی مقام بھی تھا (۵) قدم مبارک کے راستے پر تھا۔ اس شہر کے حالات دوسری کتابوں میں بھی ملتے ہیں، اس کا قدیم نام دیوان ڈیرہ تھا، اور اب ڈونڈرا کہتے ہیں، لیکن اس کی حیثیت شہر کی نہیں رہ گئی ہے، فقط ایک راس کا نام ہے، جو سمندر میں نکلی ہوئی ہے، اور لنکا کا انتہائے جنوبی کنارہ ہے[1]،

سر ولیم ٹنٹ نے اپنی کتاب سیلان جلد اول صفحہ ۱۱۳ میں لکھا ہے کہ ڈونڈرا میں پہلے ایک بہت بڑا مندر تھا، بودھوں کے قبل بھی اس جگہ ہندوؤں کا ایک مندر تھا، پھر بودھ مذہب والوں نے بھی سب سے پہلے یہاں اپنا مندر بنایا، کوہ آدم کے بعد پورے لنکا میں سب سے مقدس جگہ یہی ہے، مندر اتنا بڑا تھا کہ ایک شہر معلوم ہوتا تھا، وہاں جو بت تھا اس پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے۔ پرتگالیوں نے ۱۵۸۷ھ میں ڈی سوزا کی قیادت میں حملہ کرکے مندر کو تباہ کردیا، اس کے اندر گائے ذبح کرائی اور بے شمار جواہرات، سونا چاندی اور صندل لوٹ میں ان کے ہاتھ لگا۔ اب اس مندر کے کھنڈرات نظر آتے ہیں، دینور کا پتہ چل جانے کے بعد دیکھنا ہے کہ وہاں اسلام کی اشاعت کب اور کیسے ہوئی، اور اس کا سہرا کن لوگوں کے سر ہے۔

لنکا میں اسلام تجارتی تعلقات اور جہازرانی کی وجہ سے عرب لنکا سے پوری طرح واقف تھے، وہاں کے ساحلی علاقوں میں اس کی آمد ورفت رہتی تھی، یہ تعلقات مسلمانوں کے دور میں اور بھی بڑھ گئے، سندھ پر محمد بن قاسم کے حملہ کا سبب اسی لنکا کا ایک واقعہ ہے، لنکا میں ایک پہاڑ پر

۱؎ حاشیہ عجائب الاسفار ج ۲ ص ۳۶۰

ایک نشان ہے، جو آدمی کے قدم کا نشان معلوم ہوتا ہے، اسے ہندو شیو کے قدم کا نشان کہتے ہیں، بودھ مذہب کے پیرو شاکیہ منی مہاتما گوتم بودھ سے منسوب کرتے ہیں، اور مسلمان اسے حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نقش سمجھتے ہیں، اس لیے صدیوں سے چین، ہندوستان اور عرب کے لوگ اس جگہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں، مسلمان فقرا اور سیاحوں کی جماعت بھی اسی قدم کی وجہ سے لنکا کے اندرونی علاقوں میں پہنچی، اور اسلام کی اشاعت کے لیے راہ ہموار ہوئی، جس زمانہ میں ابن بطوطہ وہاں پہنچا ہے، اس کو مختلف مقامات میں مسلمان اور اسلامی آثار نظر آئے، اس سے پہلے خواجہ معین الدین اجمیری کے ایک خلیفہ شیخ کریم الدین[1] نے بھی لنکا جاکر تبلیغ کی تھی، اور ان سے چشتیہ کی ایک شاخ کریمیہ جاری ہوئی تھی، خواجہ عبد اللہ خفیف نے بھی اس جزیرہ میں جاکر تبلیغ کی تھی، حضرت عبد اللہ خفیف کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا ہے، آپ خواجہ ابو محمد رویم کے خلیفۂ اعظم، خواجہ ابو اسحاق شہریار گازرونی کے مرشد اور طریقت و شریعت کے مسلمہ شیخ و عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، انھوں نے لنکا کا دورہ کب کیا تھا، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، آپ کا سنہ وفات ۳۳۱ھ ہے، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ تیسری صدی کے تیسرے یا چوتھے ربع میں کسی وقت لنکا میں ورود فرمایا ہوگا، اور ان کے اثر سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا، ابن بطوطہ آپ کی وفات کے چار ساڑھے چار سو سال بعد لنکا گیا ہے، اتنے دنوں کے بعد بھی اس کو ہر جگہ حضرت عبد اللہ خفیف کے غایت عقیدت مند ملے، وہ لکھتا ہے کہ "اب تک لنکا کے لوگ شیخ عبد اللہ خفیف کی نہایت تعظیم کرتے ہیں، اور ان کو شیخ کبیر کہتے ہیں[2]"، ابن بطوطہ کو کئی مقامات ایسے ملے جہاں شیخ کبیر کے آثار تھے، قدم مبارک کی زیارت سے واپسی کے وقت ایک مقام آت کلنجہ[3] نام کا ملا، جہاں حضرت عبد اللہ خفیف

[1] ھوفزم (انگریزی) پادری جان سبحان، بیان سلسلۂ چشتیہ [2] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۳۴۴ [3] ایضاً ص ۳۵۸

گرمی کے ایام گذارا کرتے تھے، راستہ میں ایک دریا خوزان[1] ملا، یہاں حضرت خفیف کو دو نایاب قسم کے موتی ملے تھے جنھیں انھوں نے راجہ کو دیدیا تھا، بندر سلاوات کے بعد ابن بطوطہ ایسے جنگل میں پہنچا جس میں دریا تھے اور بکثرت ہاتھی رہا کرتے تھے، لیکن یہ ہاتھی پردیسیوں اور زائرین کو کچھ تکلیف نہیں دیتے اور یہ سب شیخ عبد اللہ خفیف کی برکت ہے[2]"، ہاتھی کے سلسلہ میں حضرت عبد اللہ خفیف کی یہ کرامت بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک سفر کے دوران پوری جماعت راستہ بھول گئی اور جنگل میں بھٹکتی رہی، کھانے کا سارا سامان ختم ہوچکا تھا، بھوک سے لوگ خستہ حال ہورہے تھے، اس لیے انھوں نے ہاتھی کا ایک بچہ پکڑ لیا اور اسے ذبح کرکے کھانا چاہا، حضرت عبد اللہ خفیف نے بہت سمجھایا مگر لوگ نہ مانے، رات کے وقت سب سوئے ہوئے تھے کہ جنگل میں ہاتھیوں کا غول پہنچا اور ان تمام لوگوں کو جنھوں نے ہاتھی کا گوشت کھایا تھا ہلاک کرڈالا، اور ایک ہاتھی نے حضرت عبد اللہ خفیف کو اپنی پیٹھ پر بٹھاکر شہر کے نزدیک لاکر چھوڑ دیا[3]۔ اس کرامت سے اہل لنکا بہت متاثر ہوئے، قدم مبارک تک جانے کا وہ راستہ جس سے ابن بطوطہ گذرا تھا، اول اول شیخ موصوف نے دریافت کیا تھا، اس سے پہلے وہاں کے لوگ مسلمانوں کو اس راستے سے جانے سے روکتے اور ان کو تکلیف پہنچاتے تھے، نہ ان کے ساتھ کھاتے تھے اور نہ ان کے ہاتھ کچھ بیچتے تھے، جب شیخ خفیف کے ساتھیوں نے ہاتھی کے بچے کو مارا اور اس کا گوشت شیخ نے نہیں کھایا اور رات کو ہاتھیوں نے ان سب کو مار ڈالا اور شیخ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ ایک ہاتھی ان کو اپنی پیٹھ پر سوار کرکے آبادی میں چھوڑ گیا، اس زمانہ سے کافر لوگ مسلمانوں کی تعظیم کرتے ہیں، اپنے گھروں میں انکو ٹھہراتے ہیں،

[1] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۳۴۷ [2] ایضاً ص ۳۴۴ [3] حضرت عبد اللہ خفیف کی اس کرامت کا ذکر دوسری کتابوں میں بھی ملتا ہے البتہ تفصیلات میں تھوڑا اختلاف ہے، مولانا روم نے اپنی مثنوی کے دفتر سوم کے شروع میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، مگر حضرت خفیف کے نام کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

ان کے ساتھ کھانا کھا لیتے ہیں، اور اپنے اہل و عیال کو بھی اطمینان کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، کچھ فکر نہیں کرتے، وہ اب تک شیخ عبداللہ خفیف کی نہایت تعظیم کرتے ہیں اور ان کو شیخ کبیر کہتے ہیں"[۱]

واضح رہے کہ ابن بطوطہ ۷۲۷ھ میں ادھر سے گزرا تھا، اور حضرت عبداللہ خفیف اس سے ۳۵۶ سال قبل وفات فرما چکے تھے، اتنی مدت دراز کے بعد بھی جب یہاں کے لوگ آپ سے اس قدر عقیدت رکھتے تھے تو ان کی زندگی میں ان سے عقیدت کا کیا حال رہا ہوگا، اور ان کی تبلیغی مہم کتنی کامیاب رہی ہوگی، دینور چونکہ قدم مبارکہ کے راستے پر تھا، مذہبی مرکز تھا، بندرگاہ اور تجارتی شہر تھا، اس لیے یقیناً شیخ کبیر کا وہاں گذر ہوا ہوگا، اور وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا، حضرت ممشاد علو دینوری کو حضرت عبداللہ خفیف سے بھی خلافت حاصل تھی، اس سے یہ صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ دینوری مشائخ کا تعلق انکا ہی سے ہے، خواہ یہ نسبت پیدائشی ہو یا رہائشی یا نسلی۔

ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "..... پھر ہم ایک جگہ پہنچے جس کو بڑھیا کا گھر کہتے ہیں، اس کے آگے آبادی نہیں ہے، اس کے آگے بابا طاہر کا غار آتا ہے، جو ایک ولی تھے"[۲] سفینۃ الاولیا میں شیخ ابوبکر بن طاہر دینوری کا ذکر ہے، ممکن ہے یہ غار ان ہی سے منسوب ہو۔[۳]

دینور کے دوسرے مشائخ حضرت ممشاد کے بعد مشائخ دینور میں سب سے ممتاز نام خواجہ احمد اسود دینوری کا ہے، مناقب الاصفیاء میں احمد سیاہ تحریر ہے، جو اسود کا فارسی ترجمہ ہے،[۴] یہ بزرگ حضرت ممشاد کے خلیفہ تھے، سہروردیہ اور فردوسیہ سلسلہ کے بزرگوں میں ان کو اہم مقام حاصل ہے، اپنے دور کے صوفیائے کرام میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے،

[۱] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۲۴۳ [۲] سفینۃ الاولیا (اردو) ص ۱۹۱ [۳] مناقب الاصفیاء (اردو) ص ۴۰ [۴] سفینۃ الاولیا ص ۱۴۸ (اردو ترجمہ۔ نفیس اکیڈمی، کراچی)

عبادت و ریاضت میں بلند مقام پر فائز تھے، شیخ عبدالکریم ابن ہوازن قشیری رسالہ قشیریہ میں خواجہ احمد اسود کو معتمد اعیان عصر میں شمار کیا ہے، شیخ قشیری مشاہیر ائمہ میں تھے، اور خواجہ ابوعلی دقاق کے خلیفہ اور حضرت ابو طالب مکی کے مرشد تھے، مناقب الاصفیا میں دینور کو حضرت احمد اسود کی جائے سکونت لکھا ہے، سفینۃ الاولیا نے آپ کی وفات کا سال ۳۶۶ھ تحریر کیا ہے، حضرت محمد بن عبداللہ عمویہ آپ کے مشہور خلیفہ تھے،

ابوالحسن صائغ دینوری مولانا جامی نے انھیں طبقۂ ثالثہ میں شمار کیا ہے، اصل نام علی بن محمد ابن سہیل تھا، دینور کے مشائخ کبار میں تھے، مصر میں قیام رہتا تھا، ۳۳۰ھ میں وصال فرمایا، دارا شکوہ کا بیان ہے کہ آپ حضرت ابوجعفر صید لانی کے مرید تھے، شیخ ابوالحسن فرقانی اور خواجہ عثمان مغربی آپ کے مشہور خلفاء میں تھے، ۱۵ رجب ۳۳۰ھ یا ۳۳۱ھ میں انتقال فرمایا، مصر میں مدفون ہیں،

ابوبکر کسائی دینوری دینور کے جن بزرگوں کا نام سرفہرست آتا ہے، ان میں حضرت ابوبکر کسائی بھی ہیں، انھوں نے حضرت جنید بغدادی اور اس دور کے دوسرے مشائخ کبار کو دیکھا تھا، عراق میں قیام رہتا تھا، آپ کی عظمت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت جنید فرمایا کرتے تھے، کہ اگر ابوبکر کسائی نہ ہوتے تو میں بھی عراق میں نہ ہوتا،[۱] تیسری صدی ہجری کے آخری ایام میں انتقال فرمایا،

ابوبکر بن طاہر دینوری سفینۃ الاولیا میں آپ کا مختصر ذکر ملتا ہے، آپ امام ابوبکر شبلی کے ساتھیوں میں تھے، اور جبل کے مشائخ کبار میں آپ کا شمار تھا، ۳۳۰ھ میں وصال فرمایا،

ابوبکر بن داود دینوری ان کا شمار بھی ممتاز مشائخ میں ہوتا ہے، علوم ظاہری و باطنی دونوں میں

[۱] نفحات الانس (مطبع لیسی کلکتہ) ص ۱۴۲

کمال حاصل تھا، شیخ محمد بن فضل بلخی، خواجہ ابو محمد رویم، شیخ ابو علی جرجانی وغیرہ سے فیض حاصل کیا تھا، ابو محمد کنیت تھی، آبائی وطن رے اور مولد نیشاپور تھا، مگر مشہور دینوری کے نام سے ہوئے، معلوم نہیں دینور سے کیا نسبت تھی، ۳۵۳ھ میں رحلت فرمائی، مولانا جامی کے بیان کے مطابق شیخ ابو بکر بن داؤد شام میں رہتے تھے، بعد میں دینور چلے گئے، اور وہیں ۳۵۰ھ میں ایک سو سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

ابو العاص دینوری نفحات الانس میں آپ کو طبقہ پنجم کے مشائخ میں شمار کیا گیا ہے، احمد بن محمد نام تھا، خواجہ ابو محمد رویم اور اس دور کے دوسرے مشائخ کو دیکھا تھا، مختلف ملکوں کی سیر کرتے ہوئے نیشاپور گئے، ایک مدت تک وہاں قیام رہا، وہاں سے ترمذ گئے، ترمذ سے سمرقند کا رخ کیا اور وہیں ۳۴۰ھ میں انتقال فرمایا۔

ابو عبد اللہ دینوری مولانا جامی نے انھیں بھی طبقۂ پنجم کے صوفیا میں جگہ دی ہے، محمد بن عبد الخالق دینوری نام تھا، کئی سال تک وادی القریٰ (حجاز) میں قیام رہا، اس کے بعد دینور واپس چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔

ابو القاسم واعظ دینوری دارا شکوہ[1] نے آپ کی بڑی تعریف لکھی ہے، علم فقہ، حدیث، زہد و تقویٰ و مجاہدۂ نفس اور صدق معاملہ میں اپنے وقت کے امام تھے، عطاروں کے یہاں دوا کوٹ پیچھان کر روزی پیدا کرتے تھے، عبد الصمد بن عمرو بن اسحاق نام، ابو القاسم کنیت اور لقب واعظ تھا، ۲۴ ذی الحجہ ۳۹۷ھ میں وصال ہوا، حضرت امام احمد حنبل کے روضہ کے قریب دفن کیے گئے۔

---

[1] سفینۃ الاولیاء اردو ص ۲۰۳

شفیق کی غزلگوئی

از جناب سید حرمت الاکرام صاحب، مرزاپور

شفیق جونپوری کی شاعری کسی ایک صنف سخن پر قانع نہیں تھی، ان کی مملکتِ فن میں جس قدر وسعت غزل کو حاصل تھی نظم کا حصہ اس سے کم نہیں تھا، علاوہ ازیں قصیدہ، نعت، منقبت وغیرہ پر بھی ان کی شاعرانہ گرفت اتنی ہی تھی جتنی غزل یا نظم پر لیکن ان کی سخنوری میں جہاں غزل کو خشت اول کی حیثیت حاصل ہے، وہیں اس کی اندرونی تہوں کا جائزہ لینے کے بعد ذہن اس فیصلہ تک پہنچتا ہے کہ انھیں غزل و تغزل سے جو طبعی و مزاجی مطابقت تھی، اسے نظم یا دوسرے اصنافِ سخن سے مربوط نہیں کیا جا سکتا۔

دلگدازی اور دردمندی زندگی کے سفر میں ہر گام پر شفیق کے ہم رکاب تھی، انکی روح میں ایک دبی دبی آنچ تھی ـــ وہ آنچ جو لطیف جذبوں کو بھڑکاتی ہے۔ وہ رسول عربی ﷺ کے عاشق زار بھی تھے، اور ایک پُرجوش محبِ وطن بھی، چنانچہ تنگنائے غزل کو بہ قدرِ شوق نہ پاکر انھیں وادی نظم کو بھی اپنے احاطۂ تگ و تاز میں شامل کرنا پڑا لیکن ان کی غزلوں میں جذبات و محسوسات نیز حالات و واقعات کی جو پرچھائیاں ملتی ہیں اور ان میں جو تیکھا پن یا بانکپن ہے، وہ انکی نظموں میں کم پایا جاتا ہے، انھوں نے غزل کی رمزیہ زبان میں جو کچھ کہا ہے، اس میں ان کی نظموں کی تشریح و تفصیل سے زیادہ توانائی و معنی آفرینی ہے جس کے پیش نظر انکی

غزلگوئی زیادہ دقیع، اہم اور توجہ طلب ہو جاتی ہے۔

کسی اچھے اور بڑے شاعر کی آواز میں ایک طرف اس کی شخصی زندگی کی مسرتوں اور صعوبتوں، آسودگیوں اور محرومیوں، سیرابیوں اور تشنہ کامیوں، نشاط کوشیوں اور حزن انگیزیوں کی جھلملاہٹ ناگزیر ہے، تو دوسری جانب اس کی لے پر اس کے گھریلو اور خاندانی ماحول، اس کے نسبی کوائف و عقائد، نیز اس کے گرد و پیش کے تمام تر نشیب و فراز اور پیچ و خم کی عکس انگنی بھی لازمی ہے، خواہ اسکی شکلیں کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، چنانچہ شفیق کی غزل گوئی کو فکر و فن کی کسوٹی پر پرکھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ان کے خاندانی پیش روؤں کی فہرست میں بیشتر نام علماء، حفاظ، اور پیرزادوں کے ملتے ہیں، ان کے گھرانے میں دینی عربی تعلیم کا سلسلہ کافی پہلے سے جاری تھا، خود انھوں نے مدرسہ حمد یقیہ قرآنیہ (جونپور) میں حفظ قرآن کا مرحلہ طے کیا، اور پھر اپنے دور کے رواج کے تحت فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی، شاعری و انشا نگاری، تصنیف و تالیف کا مذاق بھی انھوں نے ورثہ میں پایا، لیکن ان کی افتاد طبع، غزل کی جانب نہایت تیزی سے مڑ رہی تھی، جس کی داد انھیں اپنے والد مولانا انیق صدیقی سے نہیں مل سکی، کیونکہ وہ نعت و منقبت کی جانب مائل تھے، یا مولانا حالی کے رنگ کی قومی نظموں کو پسند کرتے تھے، چنانچہ ابتدا میں مختلف اساتذہ کی رہنمائی میں مشق سخن کرنے کے بعد شفیق کو تحریک خلافت کے دور میں حسرت موہانی سے عقیدت پیدا ہوئی جس کے اسباب میں حسرت کے رنگ تغزل کی بھی کار فرمائی تھی اور بالآخر وہ حسرت کے دامان فیض سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد یہ سوال بھی سامنے آسکتا ہے کہ خود شفیق کا نظریۂ سخن کیا ہے، اور وہ کوئی نظریہ رکھتے بھی تھے یا نہیں؟ وابستگان غزل پر بیشتر اور عموماً یہ الزام رہا ہے کہ ادب برائے ادب پر عقیدہ رکھنے کے نتیجہ میں حیات و کائنات سے ان کے ذہن و قلم کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا، یہ الزام کہاں تک صحت ہے، اس سے قطع نظر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شفیق کی شاعری قدیم فنی و شعری اقدار سے منسلک و متاثر

ہونے کے باوجود جدید میلانات اور زندگی کی نئی قدروں سے بھی اتنی ہی قریب تھی، جتنی کسی جدید شاعر کی شاعری ہو سکتی ہے۔ وہ لکیر کو پیٹنے کے قائل تھے اور نہ انھوں نے تقلیدی شاعری کی روایت کو گلے لگانا پسند کیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے اخلاقی نظریات نے ان کی شاعری کو مروجہ معنوں میں جدید یا ترقی پسند نہیں بننے دیا، وہ اپنے چوتھے مجموعۂ کلام "شفق" کے دیباچہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

"میں نہ پرانے ادب کا مذاق اڑانا جائز سمجھتا ہوں اور نہ نئے ادب سے نفرت کرتا ہوں، ادب کی تدریجی ترقی کے لیے اعتدال کی ضرورت ہے، اس لیے درمیانی راستے کو جہاں مشرقی مزاج اپنے عناصر کو محفوظ رکھتے ہوئے تازہ ہواؤں سے انبساط حاصل کر سکے، پسند کرتا ہوں"

شفیق کو قدیم ادب سے اس قسم کی انتہا پسندانہ خوش عقیدگی نہیں تھی، جو ان کے بعض ہمعصر غزلگویوں کو تھی، بلکہ مقابلتہً ان کے ذہن کا جھکاؤ تغیر پذیر ادبی اقدار کی جانب زیادہ تھا، جس کی عکاسی نہ صرف ان کی قومی، وطنی اور سیاسی نظموں میں ملتی ہے، بلکہ انھوں نے مذکورۂ بالا دیباچہ میں بھی ایک جگہ نہایت وضاحت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا ہے:

"قدیم طبقہ کی ہمنوائی اس لیے ناممکن ہے کہ ابھی تک وہ اپنی کہنگی و پامالی پر قانع ہو، فرسودگی کے مقابلے میں کسی تازگی کی گنجایش نہیں۔ جب کچھ نہ کچھ تغیرات ہر دور میں ہوئے ہیں تو عصر نو کے خوشگوار مضامین، جدید تخیل کے قابل قبول اضافے کیوں نظر انداز کیے جائیں، نئے ادب نے ایسے بھی حسین تخیلات کو شعر و سخن کے سانچے میں ڈھالا ہے، جن کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، پھر کیوں نہ انتخاب سے کام لیا جائے"

قدیم ادبی اقدار ہوں یا جدید، شفیق نے ان کے ترک و اختیار میں خود اپنے مذاق انتخاب سے کام لیا،

اور بڑی حد تک فراخدلی اور وسیع النظری کا ثبوت دیا، لیکن اس کے باوصف ادب جدید یا ترقی پسند ادب نے شفیق سے کیوں تجاہل برتا یا خود شفیق نے کشش و تاثیر کے اعتراف کے باوجود ان ادبی تحریکوں سے وابستگی کو کیوں پسند نہیں کیا، اس کے وجوہ کا تفصیلی تجزیہ کرنے کے بجائے اجمالاً یہ کہدینا کافی ہے کہ اس میں بنیادی طور پر شفیق کے مذہبی اور اخلاقی عقائد کا حصہ زیادہ تھا جس کا اظہار انھوں نے "شفق" کے دیباچہ میں صراحۃً کیا ہے، اگرچہ بعض معنوں میں یہ طریق کار شفیق کے دائرۂ مقبولیت کو محدود کرنے کا باعث ہوا، ایک طرف انھوں نے اپنی شاعرانہ شخصیت کو کسی ایک ادبی فرقہ یا طبقہ کی وابستگی سے بچایا، تو دوسری جانب اس کا ایک نفسیاتی ردعمل اس صورت میں نمودار ہوا کہ ان کے ساتھ کسی گروہ نے اتنی یگانگت نہیں برتی جس کی ضرورت جانبدارانہ توصیف وتشہیر کے اس دور میں قدم قدم، پیش آتی ہے، اور جو بعض صورتوں میں شاعر کے رنگ و آہنگ پر بھی براہ راست یا بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہے، لیکن شفیق کو اس نوع کی کسی کیفیت سے دوچار نہیں ہونا پڑا، اور ان کی شاعری خواہ وہ نظم ہو یا غزل، خود ان کی نشان دہی کے مطابق مولانا اثیق جونپوری، حسرت موہانی اور علامہ اقبال سے جس انداز میں اثر پذیر ہوئی، اس میں شفیق کی اپنی پسند یا اپنے مذاق سخن کو زیادہ دخل ہے جس کا انحصار کسی خارجی تحریک کے بجائے خود ان کی افتاد طبع پر ہے، چنانچہ ان کی نظموں میں غزلیہ لہجہ کی جو گھلاوٹ کہیں نمایاں کہیں پنہاں پائی جاتی ہے، اس کے ڈانڈے براہ راست ان کی طبعی کیفیات نیز شعری نظریات سے ملتے ہیں جن کی مشترکہ کارفرمائی ان کو غزل کا شاعر بناتی ہے، اور ان کی غزلوں کو وہ رنگ روپ عطا کرتی ہے جس پر جمالیاتی احساسات کی چھاپ نہایت گہری ہے۔

شفیق کی غزلوں کا پہلا اور بنیادی وصف لہجہ کی وہ سادگی، برجستگی اور شستگی ہے جو کسی شعر کو سماعت کے پردوں سے دل کی منزل تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے، نیز واردات قلب کے بیان میں وہ تاثیر بھر دیتی ہے جس کی لہریں احساس کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی برق رفتاری سے قلب کی

گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں، یہ کیفیت شفیق کی غزلوں میں شدت کے ساتھ نمایاں بھی ہے، اور نہایت عام بھی، لیکن ان کی غزلگوئی کا دور اول بعض مقامات پر سادگی بیان کی انتہا پسندانہ مثالیں بھی پیش کرتا ہے، جو مذاق سلیم کے نازک گوشوں سے متصادم ہوتی ہوئی پائی جاتی ہے، اس قبیل کے چند اشعار حاضر ہیں:

وعدۂ وصل و ملاقات تو ہوتا ہے مگر — خط میں لکھی نہیں تاریخ کوئی آنے کی

جب بلاتا ہوں تو انکار ہی کر دیتے ہو — کیا قسم کھائی ہے تم نے مرے گھر آنے کی

کہتے تو ہو کہ صاف کہو دل کا مدعا — تم نے اگر زبان سے انکار کر دیا

تم پر کوئی سو جان سے سو جی سے فدا ہے — تم بھی اسے چاہو تو محبت کا مزہ ہے

خدا نے حسن بھی ایسا دیا ہے — جسے چاہیں وہ دیوانہ بنائیں

ہم قبر میں سوتے ہیں وہ قبر پہ روتے ہیں — کیا منظر حسرت ہے کیا گور غریباں ہے

قیامت ایک برپا ہو گئی شہر خموشاں میں — نہ آنا تھا انھیں منہ کھولکر گور غریباں میں

کوئی روتا ہے یہ کہہ کہہ کے سر قبر شفیق — میری تقدیر میں لکھا تھا ترا غم کرنا

شفیقِ جاں بلب ہوتا ہے رخصت — کہو اب ان سے آکر دیکھ جائیں

اس کیفیت نے شفیق کی غزلگوئی کو چار چاند بھی لگائے اور بدنما داغ بھی دیے، لیکن تجربات و مشاہدات کی راہ پر ان کا ذہن جس قدر آگے بڑھتا گیا، ان کی غزلیں بتدریج مقطر ہوتی گئیں، اگرچہ ان کے متذکرہ قسم کے اشعار میں بھی ایک دبی دبی کسک اور تڑپ ضرور ہے، جو ان کے دکھے ہوئے دل کی غمازی کرتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہ وہ کوئی موقع ہو، شفیق کے دل کی چوٹ نہ چھپی ہے نہ چھپائی جا سکتی ہے، اور ان کے سینہ کا ہر زخم اوپر ہی سے نمایاں رہتا ہے، ان کی غزلوں میں جدائی دیوانی کا ذکر اکثر مقامات پر پایا جاتا ہے، جس میں انتہائی شدت بھی ہے اور انتہائی حسرت بھی، کہیں وہ شباب کے ساز محبت کے رنگین نغمے الاپتے ہیں اور کہیں اسکی گذری ہوئی

تلاطم ساما نیوں کو یاد کر کے تڑپتے ہیں اور حالی کی طرح

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت　　پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

جیسی کیفیات کے اظہار پر مجبور ہیں، انھوں نے ایک مقام پر خود کہا ہے:

دلِ حزیں کی خرابی کی ابتدا یوں ہو　　کہ ایک دن کسی محفل سے بیقرار آیا

اور دل خانہ خراب نے انھیں کبھی چین نہیں لینے دیا، وہ تا حیات صحرائے جنوں کی راتوں کو یاد کر کے اور گھٹتے رہے اور آخر کار کہہ اٹھے:

چھوڑو شفیق چھوڑو کافر بتوں سے ملنا　　اب ہو چکی جوانی کیا عاشقی کرو گے؟

شفیق نے "کافر بتوں" سے ملنا ترک کیا یا نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ رفتہ رفتہ ان کے عشق کی شوریدگی، سنجیدگی سے قریب ہوتی گئی، دل کے اضطراب کی جگہ ایک التہاب نے لے لی، وہ اندر ہی اندر سلگتے رہے، اس طرح ان کا غم سنگین تر ہو گیا اور دل کا وہ زخم جو پہلے قابلِ مداوا تھا، ناسور بن گیا، عشق کی فتنہ سامانیاں جو ایک کوہستانی آبجو کی طرح ہر بلند و پست اور قریب و دور پر چھائی چلی جا رہی تھیں سمٹنے لگیں، چنانچہ اس آبجو کے پھیلاؤ میں کمی ہو گئی، لیکن طوفانی تموج نے مرکزیت اختیار کر کے گہرائی کو بڑھا دیا، شفیق کا خمیر ہی عشق سے اٹھا تھا، وہ سراپا عشق تھے، لہذا یہ گہرائی انھیں روز بروز زیادہ غرقاب بلا کرتی گئی، ان کے یہاں نشاط پسندی اور لذت کوشی کی لہریں یوں بھی ہلکی ہی ہیں لیکن وقت کے ساتھ یہ لہریں بھی معدوم ہوتی گئیں جن کے پس پشت ایک نوع کا والہانہ پن کارفرما تھا۔ ایسا والہانہ پن جو ارضی محبت کا خاصہ ہوتا ہے۔

ان کی غزلوں کو محض حدیث کاکل و رخسار تک محدود نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ انھوں نے غزل کے موضوعات کو وسعت دینے اور ان میں تنوع پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے، لیکن بایں ہمہ وارداتِ قلب کے شوخ اور رنگین نقوش اس قدر ابھرے ہوئے ملتے ہیں کہ دوسرے نقوش دھندلا کر

مدھم پڑ جانا لازمی ہے، شفیق کے چند عشقیہ اشعار مثالاً حاضر ہیں:

مزاج بوالہوسی کا قصور ہے ورنہ　　دیارِ عشق کی آب و ہوا خراب نہیں

نصیبِ عاشقاں ایسی خوشی کیسی خوشی ہو گی　　بنا رکھا ہو جس کے غم کو بھی راحت ساماں نے

اپنی ادائے نیم نگاہی نہ پوچھئے　　اللہ جانتا ہے جو دل پر گذر گئی

ہم تمنائے ملاقات کیے جائیں گے　　آپ سو مرتبہ کہیے مرے امکاں میں نہیں

عرض بے سود، التجا بے کار　　ان نگاہوں کو کیا نہیں معلوم!

عشق میں اس قسم کی گرویدگی دیکھی نہیں　　میں نے آنکھوں سے تری تصویر بھی دیکھی نہیں

خدا کرے کہ مری آہ بے اثر ہی رہے　　میں کیا کروں گا، اگر کوئی اشکبار آیا

وہ آئے ہیں تو الٰہی سحر نہ ہو یہ سوں　　خوشی کی رات کو دے زندگی شبِ غم کی

بنی بہارِ نمو دشمنِ حیات شفیق　　بڑھا بڑھا کے مری عمر، زندگی کم کی

یا شورِ فغاں میں بھی تھی تاب رسائی　　یا ہر نفسِ سرد سے پیغامبری ہے

کہنا ہی پڑا ان کو یہ خط پڑھ کے ہمارا　　کمبخت کی ہر بات محبت سے بھری ہے

لطف اٹھاتے رہو سنتے رہو افسانۂ عشق　　یہ کہانی ہے سمجھنے کی نہ سمجھانے کی

دیکھنا ہو گا تماشا مری جانبازی کا　　تم نے کیوں تذکرۂ تیشۂ فرہاد کیا

زلفِ جاناں! شبِ فرقت کی سحر ہو کہ نہ ہو　　تیری خوشبو سے رہے شام غریباں آباد

روٹھنے والے نے آخر چوٹ کھائی میرے بعد　　لوگ کہتے ہیں، ہنسی منہ پر نہ آئی میرے بعد

کسی نے مسکرا کر کہہ دیا تھا اپنا دیوانہ　　اسی دن سے مری شوریدگی ہے اور بالیدہ

دمبدم اس رخ پہ اک رنگِ دگر پاتا ہوں میں　　ہر نگاہِ شوق کو پہلی نظر پاتا ہوں میں

تم آئینہ اٹھاؤ تو بتاؤں　　نگاہِ آرزو نے کیا خطا کی

حسرت موہانی کی غزلوں میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے جس کا اثر شفیق کی شاعری پر پڑنا ہی چاہیے تھا۔ یوں بھی شفیق کی غزلگوئی خود ان کی مزاجی کیفیات وخصوصیات کے تحت حسرت سے قربت اور مشابہت رکھتی ہے، لیکن حسرت اور شفیق کی غزلوں میں جو ہم آہنگی یا یک رنگی ہے، اسے کلی یا اساسی سے زیادہ جزوی کہا جائے گا اور اس کا تعلق ایک طرف طرز ادا کی شستگی و برجستگی، شگفتگی و پرکاری سے ہے تو دوسری طرف عشق کی ان جزئیات یا تفصیلات سے ہے جن کا اظہار دونوں کے یہاں مشترک اور یکساں ہے، اور جن کے تحت اس نتیجہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ جس طرح حسرت کی شاعری میں ارضی محبت کی دھوپ چھاؤں کی لطافتیں ہیں، اسی طرح شفیق کی شاعری پر بھی اسی فردوس آب و گل کی کسی حور کے جمال جہاں فروز کا پرتو ہے، لیکن حسرت کی شاعری میں نشاط و سرمستی کا پہلو جس قدر غالب ہے، شفیق کی شاعری میں اس کی اتنی ہی کمی ہے، اور اس کی جگہ حزن واندوہ کا تسلط پایا جاتا ہے، حسرت صرف تخلص کے حسرت ہیں لیکن شفیق حسرت مجسم ہیں، رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ کہا ہے:

"حسرت اور جگر دونوں اصلاً حسن و عشق کے شاعر ہیں، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک محبوب کی موجودگی میں اور دوسرا محبوب کی دوری پر غزلخواں ہوتا ہے، محبوب کی موجودگی وصال کی محرک ہوتی ہے، دوری محبت کی۔ جگر محبت کے شاعر ہیں اور حسرت محبوب کے۔"

حسرت محبوب کی قربت پر غزلخواں ہوتے ہیں اور یہ قربت ان کی غزلوں کو کیف و سرور کا سرمایہ عطا کرتی ہے، لیکن شفیق کا دل محبوب کی قربت کے باوجود اس تڑپ سے خالی نہیں ہو پاتا جو ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی ہے، جگر کی شاعری، محبت کی شاعری ہے، اور ان کے عاشقانہ کردار میں بھی سوز و گداز، کرب و اضطراب کا نمایاں حصہ ہے، وہ بھی دل و جان سے محبوب کے پرستار ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا عشق ایک نوع کے پندار کا حامل ہے، جس میں کسی ترمیم یا کسی لچک کی گنجائش نہیں،

اس کے برعکس شفیق عجز و انکسار کے پتلے ہیں جن کے عاشقانہ مشرب میں سرکشی و پندار کی نہ کوئی گنجائش ہے نہ اس کے جواز کی کوئی صورت، کیونکہ یہ ان کے آئین عشق کے مطلقاً منافی ہے، محبوب سے ان کی محبت اتنی والہانہ اور مجنونانہ ہے کہ وہ اس کی گلیوں کو پلکوں سے بہارنے کے آرزومند ملتے ہیں، اس کیفیت کو ایک طور پر پراگندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور یہ بیجا بھی نہ ہوگا لیکن اس کے پس منظر میں انکی سادہ دلی اور اخلاص شیوگی بھی چھپی ہوئی پائی جاتی ہے، وہ حسن کے طلبگار نہیں، پرستار نہیں بلکہ فدائی ہیں جو نیاز کیشی کو موجب افتخار تصور کرتا ہے۔

شفیق ذہنی اور فطری کسی لحاظ سے فرسودگی کے حامی نہیں کہے جا سکتے، بلکہ اس سے بیزار و گریزاں ملتے ہیں لیکن ان کی غزلوں میں نزع و اجل، نعش و تربت اور اس قبیل کے دوسرے مضامین کی کثرت ہے، اس کا جواز شفیق نے خود پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ موت سے متعلق مضامین کو ترک کر دینا عہد حاضر کی پست مذاقی کے مترادف ہے، ان کی نظر میں اس کا سبب الحاد و بیدینی کی روز افزوں وبا نیز اسلامی معارف سے نئے شاعروں کی ناواقفیت ہے، شفیق اپنے کو اسلامی شاعر کہتے تھے، اور اسلامی ادب کے حامی نیز مبلغ تھے، لہذا ان کا یہ نظریہ قابل تسلیم کہا جا سکتا ہے، اگرچہ یہ امر بجائے خود غور طلب ہے کہ شفیق کی شاعری، اسلامی ادب کے ذیل میں آتی بھی ہے یا نہیں، اور آتی بھی ہے تو کس حد تک؟ قبر، سفر حیات کی آخری منزل ہے یا اجل، زندگی کا ایک وقفہ جہاں سے انسان تازہ دم ہو کر آئندہ مراحل کی جانب بڑھتا ہے، اس سے قطع نظر یہ درست سہی کہ موت سے وحشت و بیزاری انسانی حوصلوں کے لیے وجہ ننگ ہے، لیکن شعری موضوعات کے لیے موت کے ذکر کو جزو لازم قرار دیدینا کہاں تک درست ہے؟ جس طرح اجل کے ذکر سے عمداً احتراز کرنا انتہاپسندی کا ایک پہلو رکھتا ہے، اسی طرح اس کو لازمۂ شعر بنا دینے کا نظریہ بھی انتہاپسندانہ کہا جا سکتا ہے۔

دم آخر وہ خود بالیں پہ ان کا بے نقاب آنا
شفیق جاں بلب کو آخری دیدار ہو جانا

سرھانے رات سے محشر بپا ہے محشر پر
پڑی ہے لاش ترے ناتواں کی بستر پر

قیامت ایک برپا ہو گئی شہر خموشاں میں
نہ آنا تھا انھیں منہ کھول کر گورِ غریباں میں

کہتے ہیں وہ سنکر خبرِ مرگ شفیق، آہ
کم بخت کا غم کیا کہ وہ دیوانہ تو تھا ہی

شفیق خانماں برباد کی میت نہ ہو، دیکھو
وہ آتی ہے کسی وحشی کی لاش اٹھکر بیاباں سے

ایسی نیند آئی کہ پھر موت کو پیار آہی گیا
رات بھر جاگنے والے کو قرار آہی گیا

کوئی روتا ہے یہ کہہ کہہ کے سرِ قبرِ شفیق
مری تقدیر میں لکھا تھا ترا غم کرنا

نہیں کہا جا سکتا کہ مندرجۂ بالا اشعار کس تعمیری یا اصلاحی پہلو کی نمایندگی کرتے ہیں یا ان سے زندگی کے کس شعبہ کی فلاح و بہتری مقصود ہو سکتی ہے، یہ ضرور ہے کہ ان موضوعات سے متعلق شفیق کے بیشتر اشعار میں فرسودگی اور پامالی نہیں ہے، بلکہ ایک نوع کی تازگی ہے، علاوہ ازیں اس ضمن میں ان کے قلم سے کچھ ایسے شعر بھی نکلے ہیں جن کی اثر انگیزی اور دلپذیری لائقِ توجہ ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہیں معلوم یہ گورِ غریباں کیسی بستی ہے
زمیں آباد ہو جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

سفر دراز ہے اور آفتاب ڈوب چلا
شفیق تیز اٹھاؤ قدم کہ دن کم ہے

یوں رہے گلشنِ ہستی میں برنگِ شبنم
شام کو آئے چلے وقتِ سحر دنیا سے

کتنا مغموم چلا منزلِ ہستی سے شفیق
جیسے برباد مسافر کا سفر دنیا سے

روٹھنے والے نے آخر چوٹ کھائی میرے بعد
لوگ کہتے ہیں ہنسی منھ پر نہ آئی میرے بعد

آج لیتی جا مرے غم کا سلام آخری
کس کے گھر جائے گی تو شامِ جدائی میرے بعد

ہائے اس حسنِ گلابی پر غم و حرماں کا رنگ
پھول جب مہکا کلی جب مسکرائی میرے بعد

بے رخی کی شان میری ناز برداری سے ہے
بھول جائے گا کوئی بے اعتنائی میرے بعد

اب ساز کا ہر تار ہے مائل بہ خموشی
سن لو مری آواز مرے نکتہ رسو اور

جینے کا نہیں شوق محبت کی دعا ہے
دو چار برس ساتھ رہے ہم نفسو اور

شفیق کی غزلوں میں عصری میلانات کی مبصرانہ ترجمانی کے ساتھ ساتھ طہارتِ فکر کے عناصر بھی زیادہ ہیں، جو بعض مقامات پر بے حد نمایاں ہو کر ایک "مشن" کی شکل اختیار کرتے ہوئے ملتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کوشش ان کی غزلوں کے لیے نئی لطافتوں کا سرمایہ مہیا کرتی ہے، حسرت سے وابستگی نے ان کے تغزل میں ہلکی ہلکی شوخی کی آمیزش ضرور کر دی لیکن شفیق کی فکری لطافتوں نے اس شوخی کو مخصوص حدود سے متجاوز ہونے کا موقع نہیں دیا، اور نہ اس کو حسرت کی لذت پسندی تک پہنچنے دیا، حالانکہ شفیق کے دورِ اول کے پیشِ نظر اس کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شفیق نے اقبال کے بعض موضوعات و خیالات کو بھی اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے اور نظموں سے زیادہ وہ غزلوں میں اقبال کی پیروی کرتے ہوئے ملتے ہیں، اقبال کے عہد نیز ان کے بعد کے بیشتر شاعروں کی طرح شفیق بھی اقبال سے متاثر ہوئے، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شفیق اپنی شاعری کو زندگی کے صالح و صحت مند قدروں اور اس کے ساتھ اسلام کے آفاقی پیغام کا آئینہ بنانا چاہتے تھے، لہٰذا کسی نہ کسی نہج سے ان کے ذہن و کلام پر اقبال کا پرتو پڑنا ناگزیر تھا، لیکن یہ پیروی اقبال کے آہنگ یا لہجہ کی پیروی نہیں، نہ اس میں بازگشت کی کوئی کیفیت ہے بلکہ اس کا تعلق معنی و مواد سے ہے، شفیق نے اس کا اظہار بھی کیا ہے اور اعتراف بھی، وہ "شفق" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"۱۹۴۳ء سے اقبال کا مطالعہ شروع کیا جس میں میرے نظریات ملی اور احساسات قومی کی تائید نظر آئی اور میں علامہ کے فلسفۂ وطنیت وغیرہ کی اتباع میں اشعار نظم کرنے لگا۔"

اپنے ایک اور مجموعۂ کلام "فانوس" میں (بسلسلۂ "مقدمۂ شعر و ادب") انھوں نے علامہ اقبال کی شاعرانہ و متفکرانہ شخصیت کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

"علامہ اقبال نے خودی کی حکمت ایمانی کو ناز عبدیت کے ساتھ یعنی خدا کے اقرار و بندگی کی روشنی میں سمجھا حالانکہ بندگی عجز و تذلل کا نام ہے، اور عجز و تذلل کے ساتھ گفتگو میں یہ بلند تیور کہاں نصیب ہو سکتے ہیں، لیکن یہ اسلامی تعلیم کا اعتدال ہے، نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اقوام عالم کو اس دور میں علامہ اقبال کا ممنون ہونا چاہیے کہ بندگانِ خدا کو ان کے مرتبے سے روشناس کرا دیا اور نکتہ لا ینحل خودی کو حکیم مشرق نے انسانی زندگی کا سب سے روشن اور ترقی یافتہ رخ محسوس کرکے انسانیت کو سمجھنے کا موقع دیا۔"

حالانکہ شفیق اصلاً خالص "غزل" کے شاعر تھے، لیکن ماضی سے آگہی اور حال و آیندہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، وہ چشم بینا اور دل بیدار، دونوں کے مالک تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی فکری صلاحیتوں کو روایات کا اسیر ہونے سے بڑی حد تک بچا لیا، اور اپنے عصر کے دوسرے غزلگویوں کی طرح غزل کا دامن محض تغزل تک محدود نہیں ہونے دیا بلکہ اس کو حیات و کائنات کی دوسری قدروں کے خطوط و دائرے دیکر وسیع تر کرنے کی کوشش کی، شفیق نے غزل میں نہ صرف گہرائی پیدا کی بلکہ اس کی گیرائی میں بھی اضافہ کیا، لیکن اقبال کی تقلید نے ان کی غزلوں کے حسن کو کہیں کہیں مجروح بھی کیا ہے، اقبال نے غزل کو نظم کے قریب کر دیا جسے انکی فنی بدعت کہا جا سکتا ہے لیکن انھوں نے غزل کو جو آہنگ بخشا، وہ ایک مخصوص وقفہ کے بعد سانچے میں ڈھلتا اور ان کی وضعِ فکر بن کر ابھرتا گیا، اقبال کے یہاں تغزل عموماً مفقود ہے، لہذا ان کے لیے اپنی وضع کو نباہنا نسبتاً آسان تھا، مگر شفیق نے جن کے شاعرانہ آہنگ میں "تغزل" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، بوقلموں موضوعات و مضامین سے جو تصویر بنائی ہے، اس کے بعض رنگ تصویر کی خوشنمائی کو بڑھانے کے بجائے ذوقِ نظر پر گراں گذرتے ہیں، شفیق کی غزل گوئی تغزل و تفکر سے لیکر اخلاقیات، مذہبیات اور سیاسیات تک ہر موضوع پر مشتمل ہے، اور ان کے یہاں بعض موقعوں پر تبلیغی انداز اتنا تیکھا اور نمایاں ہو جاتا ہے جس کی متحمل اقبال کی غزلگوئی تو ہو سکتی ہے، لیکن شفیق کی غزل گوئی نہیں ہو سکتی، یوں بھی مذہبی اور قومی موضوعات کو برتنے کے لیے غزل پر نظم کے قالب کو ترجیح دیجائیگی، چنانچہ شفیق نے جہاں کہیں

انتہا پسندی اور بے اعتدالی برتی ہے، وہاں غزل کی فطری لطافت کا خاتمہ ہو گیا ہے، شفیق کی مختلف غزلوں کے چند اشعار حاضر ہیں جنھیں غزل سے کوئی نسبت دیجا سکتی ہے نہ یہ غزل کے آہنگ سے میل کھاتے ہیں:

خصوصیات دیکھو وحدتِ اقوام کو دیکھو
کہ منزل ایک ہے پھر بھی الگ ہے راستہ میرا

مسلسل دوپہر سے شام تک وہ معرکے لیکن
جہاں وقت نماز آیا وہیں سر جھک گیا میرا

اشتراکیت کی زیبائش ہے حسن اعتدال
دلق پوش کارواں کو رہبر منزل بنا

کیوں حجازی قافلہ بھٹکے نہ ترکستان کو
راہ سے ناآشنا خضرِ رہ منزل بنا

ابھی تک یاد ہے ساحل پہ یا حجاج کا نعرہ
کہ اک مظلوم کی آواز پر پورا جہاز آیا

سلام اے دہلی و اجمیر کے خاموش ویرانو!
پھریں گے پھر تمھارے دن جو کوئی پاکباز آیا

سر پہ گاگر لیے جاتی ہے جو پنگھٹ کی طرف
میری جانب سے اسی دخترِ دہقاں کو سلام

یہ ملحدین، ندامت کا لطف کیا جانیں
گناہ کرکے بھی قدرِ گناہ کر نہ سکے

جنید و بایزید آئے نہ سلمان و بلال آئے
نظر مشتاق ہے دنیا میں کوئی باکمال آئے

شفیق کے دورِ آخر کی اکثر غزلیں اسی رجحان کی آئینہ دار ہیں لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ شفیق کے ذہن کا شعری یا غزلیہ رچاؤ اتنا ہمہ گیر ہے کہ وہ ہر بات کو خواہ اس کا تعلق اخلاقی و مذہبی موضوعات سے ہو یا سیاسی و معاشی مضامین سے، شعریت کی رنگینی و چاشنی بخش دیتے ہیں، ان کے یہاں صناعی اور بلند آہنگی نہیں، لیکن پرکاری اور بلند فکری ضرور ہے۔

شفیق کے متعلق چند اہل نظر کی آراء درج ذیل ہیں۔ جگر مرادآبادی لکھتے ہیں:

"وہ صحیح شعریت کے سرمایہ دار ہیں، سادگی اور پرکاری ان کی خاص صفت شعری ہے، صداقت و واقعیت ان کے ہاتھ سے کسی جگہ نہیں جاتی، یہ ان کے مذاق سلیم کی دلیل ہے، ان کے کلام میں نغمگی کی بھی کوئی کمی نہیں لیکن ایسی نغمگی جو بہت ہی لطیف و پاکیزہ ہو۔"

اقبال سہیل کی رائے یہ ہے :

" انگریزی زبان کا مشہور ادیب گولڈاسمتھ روزمرہ کے واقعات اور پیش پا افتادہ واردات کو اس خوبی اور حلاوت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ سننے والا بے اختیار سر دھننے لگے۔ یہی خصوصیت جناب شفیق کی ہے۔"

نیاز فتحپوری، "شفق" کے پیش لفظ میں شفیق کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں :

" ان کے اشعار کے پڑھنے سے شاعر کی نہ صرف اس دردمندی کا پتہ چلتا ہے جو کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جذبات میں کتنی پختگی و ہمواری ہے۔"

جس طرح شفیق کی نظموں میں نوعِ انسانی کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو کامراں بنانے کی کوشش ہے، اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی تعمیر وارتقاء کے سہانے خوابوں کی خنک روشنی ہے جسے وہ حیات کی تاریک وادیوں میں بکھیر دینا چاہتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ وہ ترقی حاضرہ نیز سائنس کے جدید کارناموں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے، کیونکہ انکی نظر میں ان کارناموں کے نتائج خوشگوار نہیں، انکی خواہش ہے کہ انسان پہلے انسان بنجائے، اسے انسانی حدود سے متجاوز دیکھنا ان کے لیے باعثِ اذیت ہے۔

شفیق کی غزلیں زبان و بیان کے لحاظ سے جتنی دلکشی رکھتی ہیں، اس سے زیادہ ان میں معنوی جمال آفرینی ہے، غزل کی روایات کا پیکر ان کے یہاں جو کچھ بھی ہے اور جیسا بھی ہو مگر اس میں رعنائی و زیبائی یقیناً ہے، لیکن یہ پیکر ہر جگہ بے جان نہیں رہتا، بلکہ ان کا تجرباتی شعور اس میں روح پھونکتا اور جان ڈالتا رہتا ہے، یہ شعور انکی عاشقانہ لے کو نشتریت اور گداختگی بھی دیتا ہے، اور ان کے یہاں حرکت و بیداری کا پیغام بھی بنجاتا ہے، ان کی غزلوں میں جو پھیلاؤ ہے وہ ان کے رنگارنگ تجربات کی حکاسی کرتا ہے، جن کے دامن میں زندگی کی پہنائیاں سمٹی ہوئی ملتی ہیں، ان کے چند اشعار مثالاً درج ذیل ہیں جن سے ان کے خصائص شعری کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

اے یادِ رفتگاں جا منزل رہی نہ جادہ
تو ڈھونڈھتی پھرے گی گردِ سفر کہاں تک

خود نکہتِ گلستاں غمازِ گلستاں ہے
غنچے چھپا سکیں گے رازِ سحر کہاں تک

کہتا تھا یہ دل، تھام کے کعبہ کا غلاف آج
اے گیسوئے جاناں! مجھے آزاد نہ کرنا

بنا لیتے ہیں پیچھے آنے والے رہنما مجھکو
مسافر کو پتہ دیتی ہے خود بانگِ درا میرا

اپنے غم کے لائق اپنی یاد کے قابل بنا
دل کے خالق! تو مجھے سر سے قدم تک دل بنا

ہو گلا اے شانِ کریمی! تیری غیرت کے خلاف
کیوں مجھے بندہ بنا کر غیر کا سائل بنا

ہے آفرینشِ عالم کی داستاں اتنی
کسی نے پردہ اٹھایا کسی کو پیار آیا

ختم کرنے کو بقا اور فنا کا احساس
اک مقام اور بھی ہے منزلِ عرفاں کے قریب

شام آئی اور یاد تری دل نشیں ہوئی
پھر کیا خبر کہ صبح ہوئی یا نہیں ہوئی

لے کے جاتی تو ہے پیغام محبت لیکن
اب وہاں جا کے صبا دیکھئے کیا کرتی ہے

شوخیٔ شوق تو مسرور ہے تنہائی پر
ان کی آنکھوں کی حیا دیکھئے کیا کرتی ہے

دردمندِ غم نظر آیا نہ جب کوئی مجھے
میری تنہائی پہ کل غربت بہت روئی مجھے

دیکھ میری لاشریکی اے خدائے لاشریک!
عمر بھر کرنی پڑی خود اپنی دلجوئی مجھے

معلوم ہوگی قدرِ محبت ہمارے بعد
بیٹھے رہو گے زلف پریشاں کیے ہوئے

آپ کے بعد اجالے کی ضرورت کیا ہے
شمع جلتی ہے، بجھا دوں تو چلے جائیے گا

دور ہوتی ہے وہ غربت میں کوسوں کی تھکن
جب کسی منزل پہ کوئی ہمسفر پاتا ہوں میں

رہے گی نکہت آوارہ عمر بھر برباد
چمن کا راز اسی نے جہاں میں عام کیا

کلی مرجھا گئی مرضی خدا کی
بہت رو رو کے شبنم نے دعا کی

نسیم صبح تو کیا سونے والوں کو جگائے گی
ابھی تو صبح خود سوئی ہوئی معلوم ہوتی ہے

سنوارا ہو نجانے کس زلیخا کی جوانی نے
مجھے ہر دور میں دنیا نئی معلوم ہوتی ہے

یہ ہوتا ہے، دیا کرتی ہیں جو پیغام بیداری
انھیں آنکھوں میں اکثر نیند بھی معلوم ہوتی ہے

اللہ اللہ! کعبہ والوں کو بھی رشک آ جائے ہے
کس ادب سے میکدے میں پاؤں رکھا جائے ہے

فرش گل ہو یا ہوائے خلد کے جھونکے مگر
آپ یاد آ جائیں تو پھر کس سے سویا جائے ہے

تم نے دیوانہ کہا تھا، وہ گھڑی بخشی کونسی
میں زمانے میں اسی نام سے مشہور ہوا

وہ بے نقاب سہی، تو نے کیوں ادھر دیکھا
مری نگاہ تجھے بے ادب نہ ہونا تھا

تنبیہ کیجئے نہ غرورِ نگاہ پر
میں کیا کروں کہ آپ کا جلوہ نظر میں ہے

مسکراتا ہے کوئی پھول تو جی ڈرتا ہے
ڈھونڈھتی ہو نہ اسے گردشِ ایام کہیں

اف! ایک سرو ناز بہ لمحاتِ انتظار
اک جسم سر سے تابقدم سوچتا ہوا

شفیق کی غزلوں میں محبت کا گداز بھی ہے، اور حوادثِ روزگار سے آنکھیں ملا کر مسکرانے کا عزم بھی، دل سوزاں ان کی آنکھوں کو اکثر پرنم ضرور رکھتا ہے لیکن ان کا سفینہ آنسوؤں کے طوفان میں ڈوبتا نہیں بلکہ اس کی موجوں سے ٹکراتا ہوا بڑھتا جاتا ہے، ان کی دردمندی اور حزن پسندی فطری ہے مگر مایوس ہونا یا شورش حالات کے آگے سپر ڈالنا نہیں جانتے بلکہ ہر نئی افتاد کے سامنے سینہ سپر رہتے ہیں۔

شفیق کا شعور اپنے دور کے ساتھ ساتھ چلا ہے، اور آنے والے دور کا نقیب بھی بنا ہے۔ اسی لیے ان کی لے میں ایک قسم کی توانائی اور حرارت ہے جو حیاتِ انسانی کی صالح اور فعال قوتوں کو بیدار کرتی ہے، شفیق کی غزلیات کا سخت سے سخت انتخاب بھی کیا جائے تو اچھے اور بلند پایہ اشعار کی تعداد معمولی نہیں ہو سکتی۔ ان کی غزل گوئی اردو کے شعری ادب میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے، جس کا اعتراف مستقبل کی تاریخ یقیناً کرے گی۔

روہیلوں کے دورِ حکومت میں اردو شاعری کا فروغ

از جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب بریلوی

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان جس ابتری اور بدامنی کا شکار رہا اس سے تاریخ داں واقف ہیں، اس بدامنی کے زمانے میں کٹھیر کے علاقے میں افغانوں نے ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی جو بعد میں روہیلکھنڈ کہلائی، ابتدا میں اس کا صدر مقام آنولہ تھا، نواب علی محمد خاں اور مکرم الدولہ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں بہادر نصیر جنگ نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں روہیلکھنڈ کو استحکام بخشا اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ ادبی فتوحات کا ماحول پیدا کیا، بعض متعصب مورخین نے روہیلوں کو خودسر، جاہل اور غاصب لکھا ہے، جو سراسر خلاف حقیقت ہے، روہیلہ خود بھی ادیب شاعر تھے، اور شعرا نواز بھی تھے، انھوں نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں خاصہ سرمایۂ شاعری چھوڑا اور بہت سے شاعروں کی سرپرستی کی، جب ان کی ادبی خدمات پر نظر جاتی ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنے مختصر دورِ حکومت میں ان کی خدمات ادب کتنی زیادہ تھیں، اور اگر ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ اور ہسٹنگز نے ان کا استیصال نہ کر دیا ہوتا تو آج اردو شاعری کی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہ ہوتی، روہیلکھنڈ کے پٹھانوں ہی پر منحصر نہیں ہے، اس وقت قوم افاغنہ کے تمام نوواردہ افراد نے ملکی اقتدار حاصل کرنے کے بعد مختلف علاقوں میں شعر و شاعری کی محفلیں سجائیں، مثلاً

فرخ آباد میں نوابینِ بنگش اردو شاعری کے بڑے قدر دان تھے، نواب احمد خاں بنگش غالب جنگ کے دیوان اور قوم اماغنہ کے ایک فرد نواب مہربان خان رند خود اچھے شاعر اور شاعروں کے مربی تھے، مرزا سودا اور میر سوز ان کے خوان کرم کے زلہ ربا تھے، امیر الامرا، نواب نجیب الدولہ کے لڑکے نواب ضابطہ خاں بھی سخن پرور امیر تھے، گو ان کا زیادہ وقت میدان کارزار میں گذرا مگر انھوں نے شعرا کی قدردانی میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی، قدوی لاہوری کچھ دن ان کی رفاقت میں رہے، اور ان کی فرمایش سے یوسف زلیخا اردو میں نظم کی جو ناتمام رہی، ظہور الدین حاتم کو بھی نواب ضابطہ خاں سے تقرب حاصل تھا، انھوں نے ایک شعر میں نواب صاحب کی تعریف بھی کی ہے ؎

حاتم اس دور کے امیروں میں ۔۔۔ حاتم اس وقت ضابطہ خاں ہے

روہیلکھنڈ پٹھانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا، ان کے قبضے میں وسیع علاقہ تھا، وہ شمالی ہند کی بساط سیاست پر اہم مہرہ تھے، جب دہلی میں نادر گردی سے شعرا ترک وطن پر مجبور ہوئے اور فکر معاش اور سخن پرور رئیسوں کی تلاش میں نکلے تو ان میں سے دو چار شاعر بریلی و آنولہ بھی آئے کیونکہ ان دونوں مقامات پر نواب علی محمد خاں و نواب حافظ رحمت خاں کے لڑکے شعر و شاعری کی محفلیں جمائے ہوئے تھے، بریلی اور آنولہ میں نو وارد شعرا کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، یہ سب شاعر صرف دہلی ہی کے نہ تھے بلکہ موجودہ روہیلکھنڈ کے مختلف اضلاع کے بھی تھے، روہیلکھنڈ کی تباہی کے بعد ہی نواب آصف الدولہ کے عہد میں دبستان لکھنؤ کی ابتدا ہوئی اور وہاں شعر و شاعری کا بازار گرم ہوا اور بڑی اہمیت حاصل کی، بریلی و آنولہ کے شاعروں کی ۱۷۷۴ء تک کی فہرست کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم روہیلکھنڈ کی اردو شاعری کی تاریخ سخن پرور امیروں کی تاریخ ہے۔ اس مضمون میں نمایاں سخن پرور امیروں کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جو ان سے وابستہ تھے۔

نواب حافظ رحمت خاں (۱۷۷۴ء)۔ پشتو، فارسی، عربی اور اردو میں دستگاہ رکھتے تھے، صاحب علم اور علم پرور تھے، نواب علی محمد خاں کے انتقال (۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء) کے بعد ان کے جانشین ہوئے، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تدبیر سیاست میں گذرا، اس مشغولیت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ شاعروں کا اجتماع کرتے مگر ان کی علم دوستی اور معارف پروری کے پیش نظر قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعروں کی سرپرستی ضرور کی ہوگی جس کا تذکرہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ الطاف علی صاحب نے ان کی ادبی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے،

"حافظ الملک پشتو و فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، وہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ صاحب دیوان شاعر تھے۔"[1]

انھوں نے حافظ الملک کے صاحب ذوق اور علم پرور ہونے کے متعلق اسٹریچی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ نواب حافظ رحمت کے پاس ایک بڑا ذخیرۂ کتب تھا جس کو ان کی شکست و شہادت کے بعد شجاع الدولہ لکھنؤ لے گئے اور جو بعد کو شاہان اودھ کے شاہی کتب خانے کی زینت بنا۔[2]

نواب حافظ رحمت خاں کی علم دوستی ان کے صاحبزادوں کے حصے میں بھی آئی، چنانچہ نواب عنایت خاں، نواب محبت خاں محبت، نواب اللہ یار خاں، اور نواب مستجاب خاں سب علم دوست تھے، نواب عنایت خاں اور نواب محبت خاں خاص طور سے شعرا کے سرپرست تھے اور مربی سخن کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔

نواب عنایت خاں (۱۱۸۷ھ ۔ ۱۷۷۳ء)۔ جنگ پانی پت (۱۷۶۱ء) کے آزمودہ اور شہرت یافتہ سپاہی تھے، ان کی شاعری کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا، البتہ وہ مربی سخن ضرور تھے، میر حسن نے میر عوض علی مدعا شاہجہان آبادی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ نواب عنایت خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔

"بعنایات یزدانی از راہ قدر شناسی و نکتہ دانی خان عالی شان خلف حافظ رحمت خاں، عنایت خاں غفر اللہ سہ صد روپیہ می دارد۔ چندے در بریلی اقامت داشت۔"[3]

۱؎ حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۹۷ (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں) ۲؎ ایضاً ص ۲۹۸ ۳؎ تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۴۳ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء)

یہ وہی مدعا شاہجہان آبادی ہیں جنھوں نے نواب محبت خاں محبت کی شادی کے موقع پر اپنا مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

متصل چھیڑ کے ہو ناسور پہ چھاتی کے نمک
پھر ہے با دل شدگاں درپے آزار فلک

پرانے تذکرہ نگاروں نے اس قصیدہ کی بہت تعریف کی ہے، میر حسن نے لکھا ہے "الحق کہ خوب گفتہ است"۔

نواب محبت خاں محبت[1] (۱۷۵۰ء - ۱۸۰۹ء) ۔ شاگرد جعفر علی حسرت، اردو کے نامور شاعر اور نہایت ذکی اور طباع تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور پشتو میں کافی کلام چھوڑا، ان کی ایک مثنوی مسمی اسرار محبت (۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲-۸۳ء) بھی بہت مشہور ہے، انھوں نے ایک فارسی آمدنامہ بھی لکھا تھا جو اب نہیں ملتا، الطاف علی صاحب نے اپنی کتاب حیات حافظ رحمت خاں میں ان کی ایک نعت کا تذکرہ کیا ہے، جس کا شمار انھوں نے تلف شدہ کتابوں کی فہرست میں کیا تھا لیکن خوش قسمتی سے یہ نعت محفوظ ہے، اور اس کا ایک خطی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے، اس کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ پشتو زبان کی نعت ہے اور اس کا نام ریاض المحبۃ ہے، پشتو کے چودہ سو دس (۱۴۱۰) الفاظ کے معانی فارسی زبان میں تحریر کیے گئے ہیں، فنی اعتبار سے یہ مکمل نعت ہے، نسخے کی نقل کا کام ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ (مطابق یکم مئی ۱۸۱۴ء) کو تمام ہوا یعنی محبت خاں محبت کی وفات (۱۸۰۹ء) کے پانچ سال بعد۔

نواب محبت خاں محبت ۱۷۷۴ء تک بریلی میں رہے، اس کے بعد ان کا قیام لکھنؤ میں رہا، نواب آصف الدولہ ان کے قدردان تھے، پہلے ان کی سرکار میں جعفر علی حسرت ملازم رہے، ان کی وفات کے بعد قلندر بخش جرأت ملازم ہوئے، جرأت نے ایک شعر میں اپنی ملازمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نوکر ہوئے بھی ہم تو محبت خاں کے
بس کہ گلچیں تھے سدا عشق کے بستاں کے

محبت خاں محبت شاعری کے علاوہ موسیقی کے بھی سرپرست تھے اور انکی سرکار سے موسیقاروں کی بھی مالی مدد کیجاتی تھی،

---

[1] نواب محبت خاں محبت کے حال میں معارف میں راقم کا ایک مستقل مضمون چھپ چکا ہے۔ اس مضمون میں بھی ضمناً ان کا مختصر تذکرہ ضروری تھا۔

نواب محبت خاں محبت شاعر کی حیثیت سے بہت ممتاز ہیں، ان کے زمانے میں اردو راہ ترقی پر گامزن تھی، نہ صرف الفاظ کی تراش خراش کا عمل جاری تھا بلکہ خیالات، مضمون اور طرز ادا میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں، اس وقت انھوں نے سادہ، بے عیب اور دلپذیر اردو میں پر اثر غزلیں لکھیں، نمونہ یہ ہے:

کسے خیال ہے ساقی شراب پینے کا
یہ عمر کٹ گئی خون جگر کے پینے سے

درد کس کا مرے پہلو میں خلش کرتا ہے
یا الٰہی مجھے کیوں رات دن آرام نہیں

میں نے چاہا تھا ترے عشق میں کھاؤں غم
لیکن افسوس ترے غم نے ہی کھایا مجھکو

آرام ایک دم کسی پہلو نہیں مجھے
یارب یہ کس کے درد سے بیقرار ہوں

ہم تو شبنم کی طرح رو دینگے
آپ تو مثل گل ہنسا کیجئے

یا وفا کیجئے یا میاں اپنا
ہم کو اتنا نہ مبتلا کیجیے

کچھ محبت نے کیا بیزار عالم سے مجھے
کچھ ہوا عالم سے میں بیزار دل کے ہاتھ سے

میں ہی دنیا میں مگر جور و جفا سہنے کو تھا
سارے عالم کے جو ہیں ظلم و ستم میرے لئے

روتے دیکھا مجھے تو دشمن کا
دیدہ بے اختیار بہہ آیا

دل تو ایک مدت ہوئی جاتا رہا سینے سے
جان بھی جاتی ہے اب میری خدا خیر کرے

کبھی روتے گذرتا ہے کبھی آہ و فغاں کرتے
نہ پوچھو کچھ مری اوقات کٹنے میں نہیں آتی

محبت خاں محبت کی مثنوی اسرار محبت، میر حسن کی مثنوی سحر البیان سے دو سال پہلے تصنیف ہوئی، مثنوی پانچسو اکیانوے اشعار پر مشتمل ہے، اس میں سسی پنوں کا مشہور قصہ عشق نظم کیا گیا ہے، مثنوی میں سسی کا سراپا اور واردات عشق بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے، زبان سادہ، بامحاورہ اور پراثر ہے، بحیثیت مجموعی اعلیٰ پایہ کی مثنوی ہے، طوالت بیان کے خیال سے میں چند شعر ہی "نمونۃً" پیش کرتا ہوں:

کبھی تو بستر غم پہ بلکنا
کبھی بالیں پہ سر دے دے پٹکنا

کبھی رو رو کے آہیں سرد بھرنا کبھی کچھ ذکر دل ہی دل میں کرنا
غرض دشوار تھا آرام پانا کبھی اٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا کبھی اٹھنا تو پھر غش کھا کے گرنا
کبھی حیران ہو کر اک سمت تکنا کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا

محبت خاں محبت کے عروج کا زمانہ ان کے قیام لکھنؤ سے وابستہ ہے، جہاں حسرت اور جرأت ان کی معارف پروری سے سرفراز ہوئے، حسرت اور جرأت دونوں اردو ادب میں پوری طرح متعارف ہیں، اس لیے ان کا مزید تعارف غیر ضروری ہے، البتہ نواب محبت خاں کے قیام روہیلکھنڈ کے زمانے میں خواجہ حسن ان کے دوست اور مشیر تھے، جن پر محبت کی بڑی عنایات تھیں، اس لیے ان کا مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔[1]

خواجہ حسن ۔ اردو کے ان گمنام شاعروں میں سے ایک ہیں جو صاحب کمال ہونے کے باوجود شہرت سے محروم رہے، ان کا سلسلۂ نسب خواجہ کمہاری چشتی مودودی سے ملتا تھا، جو دلی کے معروف درویش تھے، خواجہ حسن کا مکان محلہ پہاڑ گنج دلی میں تھا، بعد میں وہ ترک سکونت کرکے بریلی آ گئے تھے، خاندان روہیلہ میں ان کی بہت منزلت تھی، نواب محبت خاں سے ان کے تعلقات بہت قریبی تھے، وہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، موسیقی اور درویشی میں بہت مشہور تھے، انھیں علم نجوم میں بھی دخل تھا، تصوف کے رموز سے بھی آشنا تھے،

"صوفی مشرب اکثر مسائل صوفیہ را کہ مراد از وحدت وجود باشد بدلائل و براہین چنانچہ شیوۂ صوفیاں با فضل و کمال است از روئے نص و حدیث باثبات رسانید"۔[2]

---

[1] محبت خاں محبت اور ان کا کلام کے عنوان پر ہم ایک مفصل مضمون قلمبند کر چکے ہیں، لہٰذا محبت پر تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے معارف مئی ۱۹۶۳ء و جون ۱۹۶۳ء [2] تذکرہ ہندی از مصحفی ص ۷۶ مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۳ء

ان کو شاعری کا بھی شوق تھا، ایک ضخیم دیوان مرتب کیا، روہیلکھنڈ کی تباہی کے بعد فیض آباد پہنچے، اور وہاں سے لکھنؤ، لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ نے ان کی آؤ بھگت کی، کچھ دن کے بعد نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں کی سرکار سے منسلک ہو گئے، انھیں ایک زن بازاری سے عشق تھا جس کا نام بخشی تھا، غزل کے مقطع میں اس کا نام وہ بالالتزام داخل کیا کرتے تھے، کلام کا نمونہ یہ ہے:

یہی شورش عشق ہے تو الٰہی توبہ اس آغاز کا کیوں انجام ہوگا
موئے ہم تو پہ بے قراری وہی ہے خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا
اگر نزع سے جان بخشی حسن کو تو اس میں تمھارا بڑا نام ہوگا

یہ تونے مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی یہاں دل جلایا اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی
کچھ اور تو ہوا نہیں ہے ساری عمر میں تقصیر یہ ہوئی کہ میں تقصیر کچھ نہ کی
مرتا ہے جاں کنی میں حسن حیف تم نے رات اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

رام جس محیط و مغموم نے مثنوی حسن بخشی میں ان کے عشق کا قصہ نظم کیا ہے۔

نواب محمد یار خاں امیر (المتوفی ۱۷۷۵ء)۔ روہیلکھنڈ کی معروف شخصیت، خوش فکر شاعر اور بڑے مربی سخن گزرے ہیں، وہ نواب علی محمد خاں کے صاحبزادے اور نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کے چھوٹے بھائی تھے،

نواب حافظ رحمت خاں نے ۱۷۵۴ء میں علی محمد خاں کے لڑکوں کو مستقل جاگیریں دیدی تھیں اور ان کے صغیر السن لڑکوں کو ان کے ساتھ کر دیا تھا تاکہ مناسب تربیت ہو سکے اور باہمی نزاع بھی دور ہو جائے، نواب فیض اللہ خاں کو رامپور، چھاچھٹ اور شاہ آباد کا علاقہ ملا تھا اور نواب محمد یار خاں امیر بوجہ صغر سنی ان کی تربیت میں دیے گئے تھے، نواب محمد یار خاں امیر ٹانڈہ آنولہ میں رہتے تھے، انھیں شاعری اور موسیقی سے دلچسپی تھی، انھوں نے ان دونوں فنون کے ماہرین کی سرپرستی کی، اس وقت

محمد قیام الدین قائم بسولی بدایوں میں نواب دوندے خاں کی سرکار میں ملازم تھے، میر سوز اور مرزا سودا فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند کی محفل سخن سے منسلک تھے، نواب محمد یار خاں امیر نے میر سوز اور مرزا سودا کو ٹانڈہ آنے کی دعوت دی مگر وہ نہیں آسکے، اس کے بعد انھوں نے قائم کو بلایا اور وہ بسولی سے ٹانڈہ چلے آئے، نواب صاحب نے فن شعر میں ان سے تلمذ اختیار کیا اور سو روپیہ ماہانہ ان کی تنخواہ مقرر ہوگئی،

نواب محمد یار خاں امیر کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے:

"در علم موسیقی دستار زدن یگانۂ روزگار و رعنائی و زیبائی جوانے بود باغ و بہار۔ در ایامیکہ برتر غیب حکیم کبیر سنبھلی شوق شعر ہندی دامن دلش را بسوے خود کشید، خطی بطلب میر سوز و مرزا محمد رفیع نوشتہ روانہ کرد۔ چوں در ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان رند تخلص بصیغۂ شاعری عزو امتیاز داشتند از فرخ آباد آمدن ایشان بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باش نواب بود اتفاق نیفتاد آخر کار میاں محمد قائم کہ در آں ایام در بسولی بودند حسب الارشاد آمدہ شرف ملازمت آں والا جناب دریافت و بدر ماہہ یک صد روپیہ عزو امتیازش دادہ باستادیش برداشت[1]"

اس کے بعد مصحفی نے اپنے متعلق لکھا ہے:

"حقیر مصحفی از حاضران مجلس او بود و ہر وقت کہ غزل طرح می فرمودند بسر انجام می رسانید[2]"

قائم نے نواب محمد یار خاں امیر کی شان میں لکھا ہے:

تجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سا لے امیر
مجتمع سایہ میں ہیں جس کے سخنداں ایسے

نواب امیر کا مجموعۂ کلام نہیں مل سکا، پرانے تذکروں میں ان کے اشعار قلیل تعداد میں ملتے ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ستھرے شعر کہنے پر قادر تھے، ان کے بعض اشعار میں قائم کا رنگ بھی جھلکتا ہے سادگی اور تاثیر ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، کلام کا نمونہ یہ ہے:

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۱۴ [2] ایضاً

اس منہ سے آہ کچھ نہ نکلا
جز نالہ و آہ کچھ نہ نکلا

دیکھی جو میں سرنوشت اپنی
جز روز سیاہ کچھ نہ نکلا

کیا تو نے دیا تھا مجھکو ساقی
شیشہ میں تو واہ کچھ نہ نکلا

تیرے گھر جانے سے یاں اپنا تو گھر جاتا ہے
اے مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے

اللہ رے سرخی ترے چہرے کی ہنگام عتاب
جتنا ہی بگڑے ہے اتنا ہی سنور جاتا ہے

اس نکار انداز سے لگ کر کوئی چھٹتی ہے آنکھ
کیوں نہ ہوسوئے قضا منہ وقت دم تکبیر کا

سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے میخواری سے
لہو اترا ہے تری آنکھوں میں خونخواری سے

وقت رخصت کے ترے اے مرے جی کے دشمن
تھام تھام آج رکھا دل کو میں کس خواری سے

بس میں آیا جو تمھارے اسے جا ہو جو کرو
کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

کس نے نظروں میں خدا جانے اسے مل ڈالا
نرگس آج آنکھ اٹھاتی نہیں بیماری سے

کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیر
گھر میں جاتے ہیں پرائے تو خبرداری سے

کیا عجب بال ملائک تھیں اس جا گہ فرش
جس جگہ پاؤں رکھے صاحب مسند میرا

جنس طاعت سے کچھ اپنے تو نہیں پاس امیر
مگر احمد کا ہوں میں اور ہے احمد میرا

نواب محمد یار خاں امیر کی عظمت کا راز ان کے مربی سخن ہونے میں پوشیدہ ہے، ان کی محفل سخن میں شاعروں کا خاصہ اجتماع ہوگیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر اگر ٹانڈے کی محفل برہم نہ ہوتی تو اس دیار میں اردو شاعری کو غیر معمولی فروغ ہوتا، محمد قیام الدین قائم، غلام ہمدانی مصحفی، حکیم کبیر سنبھلی، سید پروان علی شاہ پروانہ، نعیم اللہ خاں نعیم، فدوی لاہوری ٹانڈے میں مقیم ہوئے، اور نواب صاحب نے ان کی قدر و منزلت کی، قائم و مصحفی جب ٹانڈے آئے تو ان کی شہرت ہمرکاب آئی، یہ دونوں مشہور شاعر تعارف سے مستغنی ہیں، حکیم کبیر، پروانہ، نعیم اور فدوی لاہوری کا مختصر تعارف یہ ہے۔

حکیم کبیر سنبھلی ایک ذی حیثیت شاعر تھے، وہ نوابین روہیلہ کے پرانے نمکخوار اور نواب محمد یار خاں امیر کے رفیق تھے، ان ہی کی ترغیب پر امیر نے شعر گوئی شروع کی تھی، ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے، مصحفی نے ان کے متعلق لکھا ہے[۱]:

"حکیم کبیر سنبھلی شیخ انصاری بودہ و کبیر تخلص می گذاشت۔ فقیر ایشاں را در سرکار نواب محمد یار خاں امیر مرحوم کہ ذکر ایشان گذشت دیدہ بود بسیار بخوبی پیش آمدہ بہ سبب تمادی ایام یک شعر از ایشان بخاطر است

ایک ہی یار سے جی ناک میں آیا ہے کبیر | زیست معلوم اگر ایسے ہی دو چار ملے

سید پروان علی شاہ پروانہ مرادآبادی، قائم کے توسل سے نواب محمد یار خاں امیر کی بزم سخن میں داخل ہوئے، قلندر وضع اور صاحب کشف تھے، ان کے متعلق گلشن ہند میں ہے[۲]:

"دریں زمانہ کہ عہد عالم شاہ است شنیدہ شد ترک دنیاداری کردہ لباس فقر پوشیدہ۔"

مصحفی لکھتے ہیں[۳]:

"جوان شوریدہ سر و قلندر وضع بود بنگ و شراب و شدت تیز و کسب و شغل نفی و اثبات وغیرہ نیز راہ داشت گاہ گاہے از و کشف کہ اہل کمال را باشد مشاہدہ کردم۔ معرفت محمد قائم در سرکار محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گذشت او ہم در سلسلۂ شعرا جا داشت و چیزے کہ موزوں می کرد از نظر ایشاں می گذرانید۔"

ان کے شعر مندرجۂ ذیل ہیں:-

تیغ ثابت نہ رہی دل نہ کوئی جان درست | اسکی مژگاں نے کیے پھر پہ دو پیکان درست
ہمت حضرت قائم سے اگر ہو امداد | چند ایام میں کر لیجئے دیوان درست
الفت جو کی ہو تم نے تو میاں اسکا ساتھ دو | یا دل جو لے گئے ہو مرا میرے ہاتھ دو
اپنا تو دل زمانہ سے اب اتنا تنگ ہے | جو دم ہے زندگی کا سو شیشہ پہ سنگ ہے،

۱؎ تذکرہ ہندی ص ۱۹۰ ۲؎ گلشن ہند ص ۷۰، مطبوعہ انجمن ترقی اردو دکن ۳؎ تذکرہ ہندی ص ۴۵

نعیم اللہ خاں نعیم، شاگرد شاہ حاتم، نواب محمد یار خاں امیر کی سرکار میں ایک جوان العمر اور پرگو شاعر تھے، انھوں نے ایک ضخیم دیوان بھی مرتب کیا تھا، ان کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے[۱]:

"فقیر او را در آنولہ دیدہ بود کہ بعد چندے در سرکار نواب محمد یار خاں نوکر شد چوں ملازمت نواب مؤلف ہم در آں نزدیکی کردہ قصیدۂ مدح بگوش حضار رسانیدہ و اخل صحبت کیمیا خاصیت شد لہٰذا اکثر اتفاق ملاقات می افتاد۔"

نعیم ٹانڈہ کی محفل اجڑ جانے کے بعد موضع آنر چھینڈی (آنولہ) چلے گئے، جہاں مرض استسقا میں مبتلا ہو کر وفات پائی، ان کے اشعار یہ ہیں:

آفت کی نشانی ہی رہے ہم تو زمیں پر | جو سنگ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر
گر تجھے منظور تھا غیروں سے ہونا آشنا | پھر عبث تو کیوں ہوا تھا ہم ہمارا آشنا
تیری خاطر کیلئے سنتا ہوں اے بیگانہ وضع | سب مرے دشمن ہیں کیا بیگانہ و کیا آشنا
کوچۂ یار سے دل ہم سے اٹھایا نہ گیا | مل گیا خاک میں اس طرح کہ پایا نہ گیا
تا بہ عبث تو نے کی جان مضطر | ابھی تو ہمیں آرزو بھی کسو کی

فدوی لاہوری شاگرد صابر علی شاہ صابر، اردو شاعری کی تاریخ میں جانی پہچانی شخصیت ہیں، سودا کے ایک ہجو میں ان کی تضحیک کی ہے، وہ سودا سے مباحثہ و مجادلہ کے لیے فرخ آباد بھی پہنچے تھے، میر حسن نے لکھا ہے[۲]:

"مردے بر خود غلط برائے مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیش مرزا رفیع سلمہ اللہ آمدہ ہنگامہ برپا نمود بعد از ذلت بسیار بہ وطن خود برگشت۔"

مصحفی رقمطراز ہیں[۳]:

۱؎ تذکرہ ہندی ص ۲۵۹ ۲؎ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۹۰ ۳؎ تذکرہ ہندی ص ۱۶۷

"الحاصل چوں ازاں طرف آوردہ شدہ بہ ملک ہندوستان رسیدہ دعوائے شاعری در دماغش جا داشت وزیادہ از مرتبۂ شاعری قدم در راہ امرد پرستی می گزاشت چند جا خانہ جنگی ہم کردہ و بہ کودکان حسین تعشق ورزیدہ اکثر اعضایش دیدم کہ مجروح بودند۔"

اس کے بعد مصحفیؔ ان کے آنولہ پہنچنے کے متعلق لکھتے ہیں:[۱]

"در ایامیکہ از شاہ جہان آباد در کھتیر آمد دراں روزہا فقیر در آنولہ بود کہ شورش او بسمع رسید آخر روزے برائے دیدنش رفتم اوباش چند گرداو نشستہ دیدم صحبت شعر میاں آمد۔"

آنولہ میں فدویؔ کی رسائی نواب محمد یار خاں امیر کے دربار میں ہوگئی، لیکن جلد ہی برخاست بھی ہوگئے، مصحفیؔ نے لکھا ہے:[۲]

"بعد چند روزے شنیدم کہ بہ سرکار نواب محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گزشت نوکر شدہ بود بعد دو سہ ماہ میاں محمد قائم وغیرہ و فقیر ہم باریاب مجلس ایشاں شدند بسبب برہم زدگی مزاج نواب کہ بیان آں موجب تطویل است برخاستہ رفت۔"

مصحفیؔ نے لکھا ہے کہ ان کی عمر پچاس سے زیادہ تھی، اور وہ مرادآباد میں فوت ہوئے، انکی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مصحفیؔ نے لکھا ہے:[۳]

"در گفتن قطعہ طویل در ہر غزل ید طولیٰ داشت و نازش شاعری او اکثر بر ہمیں بود۔"

ان کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں:

ڈلتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے | ہم داد خواہ ساتھ ہیں اسکے جہاں چلے
کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیر آہ سے | یہ بھی ہے تیر ایک کہ سدا بے کماں چلے
سر پر تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار | ہر اک قدم پہ روتے ہوئے خونفشاں چلے

[۱] تا [۳] تذکرہ ہندی ص ۱۶۷

لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں | بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی لے دُستاں چلے
یاروں نے اپنی راہ لی فدویؔ ہمیں رہے | وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

نواب محمد یار خاں امیرؔ کی محفل سخن میں، بروایت مصحفیؔ، ایک بذلہ گو میاں عشرتؔ بھی ملازم تھے، جن کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں،

مولانا عبدالسلام صاحب ندویؒ نے نواب محمد یار خاں امیرؔ کے سلسلے میں لکھا ہے،[۱]

"نواب محمد یار خاں امیرؔ بھی شعراء کی قدردانی میں اپنے ہمعصر امراء سے کم نہ تھے...... شاہ حاتمؔ کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب موصوف ان کی قدردانی بھی کرتے تھے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

ممتاز کیوں نہ ہووے وہ اپنے ہمسروں میں | حاتمؔ کا قدرداں اب نواب امیرؔ خاں ہے

لیکن ہماری رائے میں حاتمؔ نے اپنے شعر میں عمدۃ الملک نواب امیر خاں انجامؔ کی مدح کی ہے جو قائمؔ چاندپوری کی اطلاع کے مطابق محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہفت ہزاری منصب پر فائز تھے اور بعد کو الٰہ آباد کے صوبیدار مقرر ہوئے،[۲] ڈاکٹر بابو رام سکسینہ نے لکھا ہے کہ شاہ حاتمؔ تھوڑے عرصے تک نواب امیر خاں صوبہ الٰہ آباد کی رفاقت میں رہے،[۳] اس لیے شاہ حاتمؔ کا نواب محمد یار خاں امیرؔ کی رفاقت میں رہنا ثابت نہیں ہوتا، مصحفیؔ نے بھی شاہ حاتمؔ کے متعلق کہیں نہیں لکھا ہے کہ وہ ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں امیرؔ کی سرکار سے منسلک رہے، اس لیے جن شعراء کا ذکر ہم نے گذشتہ سطور میں کیا ہے وہی ٹانڈہ میں مقیم ہوئے اور نواب محمد یار خاں امیر کی محفل سخن میں باریاب بھی،

نواب محمد یار خاں امیرؔ کی محفل سخن ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۲ء میں درہم برہم ہوگئی کیونکہ امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے لڑکے نواب ضابطہ خاں کو شاہ عالم اور مرہٹوں کی فوج کے مقابلے میں بمقام سکرتال شکست ہوئی،

[۱] شعر الہند ج ۲ ص ۳۴۴ [۲] مخزن نکات ص ۲۱ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۲۹ء [۳] تاریخ ادب اردو ص ۱۰۱

اور یہ خبر اڑ گئی کہ مرہٹے روہیلکھنڈ میں بھی داخل ہونے والے ہیں، مرہٹوں کی تاراجی مشہور تھی، اسلیے حفظ ماتقدم کے لیے آنولہ اور بریلی کے عوام و خواص پہاڑ کے دامن میں چلے گئے، اس افراتفری میں ٹانڈے کی محفل سخن بھی اجڑ گئی، نہ ان کے سخن سنج رہے نہ ان کے مربی ع

اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو | بن بن کے کھیل ایسے اکثر بگڑ چکے ہیں

روہیلکھنڈ کی ادبی زندگی کا یہ سانحہ عظیم تھا، روہیلوں کی حکومت مرہٹوں کی یورش کے بعد مزید دو سال قائم رہی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نواب محمد یار خاں امیر کی محفل ادب اجڑنے کے بعد اس دیار میں شعر و شاعری کی چہل پہل ختم سی ہو گئی، مصحفی نے لگ بھگ چالیس سال کے بعد لکھا:

"واللہ کہ یاد آں صحبت گذشتہ داغ ناکامی بر دل درد مندمی گذارد"۔

متذکرہ بالا سطور میں سخن پرور امراء کا ذکر اور ان شعراء کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے جو انکی سرکار میں ملازم تھے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس وقت شاعری صرف امیروں کے دربار تک محدود تھی، آنولہ اور بریلی روہیلکھنڈ کے صدر مقام تھے، اور اطراف و جوانب کے دوسرے شعراء بھی فکر معاش یا داد سخن کی خاطر ترک سکونت کر کے ان دونوں مقامات میں آ گئے تھے، ان شعراء کا ذکر کیے بغیر روہیلکھنڈ کی دور قدیم کی ادبی زندگی کا جائزہ نامکمل رہے گا، اس لیے ایسے چند شاعروں کے حالات اور ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

عشقی مراد آبادی ۔ مصحفی نے انھیں آنولہ میں دیکھا تھا، وہ لکھتے ہیں[1]:

"فقیر او را در آنولہ دیدہ بود شعرے از و بخاطر است"۔ ع

کوئی تو ہے گچھرہ کوئی سرو رواں ہے | دیکھا تو یہاں ایک سے ایک آفت جاں ہے

عظیم ۔ یہ بھی آنولہ میں مقیم تھے، ان کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے[2]:

"جوانے بود سپاہی پیشہ یک غزل خود در آنولہ پیش فقیر خواندہ بود، سہ شعر از و انتخاب افتادہ است"

کار واں اشک کا ہوتا ہے رواں آنکھوں سے | تم کو بھی آہ و فغاں ہم یہ خبر کرتے ہیں

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۵۲ [2] ایضاً

کوئی اگر تم میں سے چلتا ہے تو آ جائے شتاب | ورنہ اب یار تو کوئی دم میں سفر کرتے ہیں

کچھ نگہ میں نہیں آتا ہے بجز جلوۂ یار | جب کہ ہم دل میں عظیم اپنے نظر کرتے ہیں

قدرت ۔ ان کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے[1]:

"مولوی قدرت اللہ قدرت مؤلف تذکرہ ہندی گویان کہ بالفعل در رامپور استقامت دارد فقیر او را در ایامیکہ برفاقت نواب محمد یار خاں عزو امتیاز داشت پیش محمد قائم روزے دیدہ بود از وست ع

لاکھوں جلا دیے مردۂ صد سالہ آن میں | فیض دم مسیح ہے اس کی زبان میں

نکلی تھی رات دل سے مرے وہ بید رنج آہ | ہنگامہ ایک پڑ گیا ہفت آسمان میں

انصاف بھی ضرور ہے یہ ظلم تا کجا | لاکھوں کے گھر تو جاتے رہے امتحان میں

مراد علی حیرت مراد آبادی ۔ فن شعر میں شہرت یافتہ تھے، میر حسن نے لکھا ہے کہ طبع رسا رکھتے تھے، آنولہ میں ان کا بھی قیام رہا، مصحفی نے ان کے متعلق لکھا ہے[2]:

"فقیر او را در آوان آبادی کٹھیر روزے در آنولہ دیدہ بود۔ شعر را بہ پاکیزگی می گفت۔ در ہماں ایام شنیدم کہ بطرف کوہ برائے کارے حسب ایمائے رئیسے رفتہ بود کہ آفتاب زندگیش در ہماں کوہ بغروب نہادہ"۔

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

سمجھ کے دیکھا تو بیجا ہے سب گلہ دل کا | کہ چشم تر نے ڈبویا معاملہ دل کا

یہ اشک و آہ ہے شور جنوں ہے وحشت ہے | عجب جلوس سے جاتا ہے قافلہ دل کا

کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر | مری بغل میں چھلکتا ہے آبلہ دل کا

کیا قافلے یادوں کے آگے کہیں ٹھہرے ہیں | آواز جرس کم ہے یا کچھ ہمیں بہرے ہیں

ہندو امرا میں دیوان مانرائے کے فرزند بلاس رائے رنگین ایک معروف شاعر تھے، میر حسن نے انکے متعلق لکھا ہے[3]:

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۷۵ [2] ایضاً ص ۷۹ [3] تذکرہ شعرائے اردو ص ۷۴

"لالہ بلاس رائے المتخلص بہ رنگین خلف ماجہ مان رائے دیوان مدار المہام پسر محمد علی روہیلہ است طبع موزونے دارد، ہر جاکہ باشد سلامت باشد۔ از وست

اس مصیبت سے جو تو گھر سے نکالے ہے مجھے　　　یہ تو بتلا میں بھلا جاؤں کدھر آخر شب

نواب حافظ رحمت خاں کی اولاد میں نواب اللہ یار خاں اور نواب مستجاب خاں بھی کافی مشہور ہوئے، نواب اللہ یار خاں (۱۷۵۱ء تا ۱۸۳۲ء) بھی ادب پرور رئیس تھے، ان کی شاعری کا کوئی نمونہ تو دستیاب نہیں ہو سکا البتہ ان کی ایک پشتو اردو لغت مسمی عجائب اللغات نظر سے گذری جس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، نواب مستجاب خاں (۱۷۵۸ء تا ۱۸۳۲ء) عربی، فارسی اور پشتو زبان کے ماہر اور اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب تھے۔"[1] انھوں نے اپنے والد کے حالات میں ایک کتاب فارسی میں لکھی جس کا نام گلستان رحمت ہے، روہیلوں کی تاریخی کتب میں گلستان رحمت سب سے زیادہ اہم ہے، یہ بیش بہا کتاب کیا باعتبار صحت واقعات اور کیا باعتبار زبان فن انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے، نواب مستجاب خاں نے یہ کتاب لکھکر نہ صرف روہیلوں کے نامور سردار بلکہ ایک پوری قوم کو زندہ جاوید کر دیا۔[2] نواب صاحب کی شاعری کا علم نہیں ہو سکا،

نواب شجاع الدولہ اور نواب حافظ رحمت خاں کی فوجوں کے درمیان ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو لڑائی ہوئی جس میں روہیلوں کو شکست ہوئی اور ان کا آفتاب اقبال غروب ہو گیا، جنگ سکرتال کے بعد اگرچہ نواب محمد یار خاں امیر کی محفل سخن اجڑ گئی تھی لیکن شمع امید بالکل نہیں بجھی تھی، مگر جنگ روہیلہ کے بعد شاعری کا چراغ بالکل بجھ گیا، نہ شعراء رہے نہ شعراء نواز، دربار ختم ہو گئے، اور ان کے ساتھ شعراء کی سرپرستی کی روایت بھی، نواب محبت خاں محبت نے لکھنؤ میں محفل سخن جمائی، وہ چراغ جو بریلی میں روشن تھا، اس کی تنویر سے لکھنؤ جگمگا گیا، نواب محمد یار خاں امیر اور محمد قیام الدین قائم

[1] حیات حافظ رحمت خاں از الطاف علی ص ۲۴۹ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں [2] ایضاً

رامپور چلے گئے، اور وہیں فوت ہوئے، مصحفی لکھنؤ پہنچے، مولوی قدرت اللہ قدرت نے بھی رامپور میں سکونت اختیار کی۔ دراصل رامپور نے جنگ روہیلہ کے بعد شعراء کی بڑی سرپرستی کی اور سابقہ روایات کو قائم رکھا، اس وقت بریلی کے بہت سے شاعر رامپور پہنچے اور خاصے کامیاب ہوئے، بدقسمتی سے ان کے حالات اور ان کے شعری اکتساب پر ہنوز گرد گمنامی جمی ہوئی ہے، تاریخ ادب میں رامپور کی خدمات کا ذکر ۱۸۵۷ء کے بعد سے کیا جاتا ہے، حالانکہ وہاں شعراء کا اجتماع ۱۷۷۴ء کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا، اور امرائے ان کی سرپرستی بھی کی تھی، شعرائے بریلی میں میر غلام علی عشرت، شاگرد مرزا علی لطف، ایک غزل گو، مثنوی نگار، داستان نویس اور صاحب علم و فن شاعر تھے، نواب فیض اللہ خاں کے داماد نواب محمد عثمان خاں نے انکی سرپرستی کی، عشرت بہت مشہور شاعر تھے، اور رامپور سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ اصل میں روہیلکھنڈ کی نوابی ختم ہونے کے بعد رامپور نے شعر و سخن کی ابتدا ہی سے سرپرستی کی، اور اس باب میں انکی خدمات مفصل تحقیقی مطالعے کی متقاضی ہیں،

۱۷۷۴ء کے بعد بریلی میں شعر و سخن کی جو بنیاد پڑی وہ قدرۃً دربارداری سے مستغنی تھی، نواب حافظ رحمت خاں کے صاحبزادگان، دو ایک کو چھوڑ کر، بریلی ہی میں رہے، وہ سب صاحب علم و فن تھے، ان میں نواب اللہ یار خاں اور نواب مستجاب خاں کا ذکر ہم گذشتہ سطور میں کر چکے ہیں، حافظ الملک کے پوتوں میں نواب سعادت یار خاں صاحب، عبدالعزیز خاں عزیز، نیاز احمد خاں ہوش، نواب ظفریاب خاں راسخ، نواب حیدر حسین خاں حیدر، اور نواب بہادر خاں معروف مشہور شاعر گزرے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے ختم ہونے کے بعد بھی نوابین روہیلہ دل و جان سے اردو شاعری کی خدمت کرتے رہے، اور ہم نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ایسا محسوس کیا کہ نواب نیاز احمد خاں ہوش کے انتقال (۱۸۹۲ء) تک بریلی کا شعری ماحول ان کے قبضے میں رہا، اسوقت بریلی کے دیگر اساتذہ بھی کسی نہ کسی طرح ان کی قربت سے سرفراز ہوئے، البتہ بیسویں صدی میں خاندان روہیلہ میں کوئی قابل ذکر شاعر پیدا نہیں ہوا اور انکی روایات شاعری انیسویں صدی کے آخر میں ختم ہو گئیں

ادبیات

عالمِ حضوری میں

از جناب پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری صدر شعبۂ فارسی و اردو جی ایف کالج شاہجہاں پور

عالم آرا و دل آرا پہ درود اور سلام
اپنی اس جانِ تمنا پہ درود اور سلام

ظلمتِ دہر ہوئی کس کی ضیا سے روشن
ہمہ تن برقِ تجلّا پہ درود اور سلام

ساقیِ میکدۂ معرفتِ اہلِ نظر
حاملِ ساغر و صہبا پہ درود اور سلام

شافعِ محشر و محبوبِ خدائے دو جہاں
سرورِ عالمِ بالا پہ درود اور سلام

کس نے توحید کو پھر زندگیِ نو بخشی
جانِ موسیٰ و مسیحا پہ درود اور سلام

رہبرِ خلقِ جہاں بانیِ اصلاحِ امم
شرفِ رتبہ والا پہ درود اور سلام

جسدِ خاکی و انوارِ خدا کا مظہر!
سر بسر روحِ مصفّا پہ درود اور سلام

فاتحِ قلب و نظر، نازِ عرب، فخرِ عجم
رشکِ صد قیصر و دارا پہ درود اور سلام

بزم میں رزم میں اور زیست کے ہر شعبہ میں
صاحبِ سیرتِ اعلیٰ پہ درود اور سلام

وارثِ نورِ محمد، شرفِ بزمِ وجود
اہلبیتِ شہِ والا پہ درود اور سلام

مطلعِ نور ہے یا صبحِ سعادت کا طلوع
جلوۂ گنبدِ خضرا پہ درود اور سلام

خاکِ پا نکہت مشتاق ہے پھر گرمِ حضور
میرے آقا مرے مولا پہ درود اور سلام

غزل

از جناب سید علی جواد صاحب زیدی

یہ وہم ہے کہ جنوں ہو، یہ لاگ ہو کہ لگن
کسی کا ذکر بھی آیا تو بڑھ گئی الجھن

یہ تجربوں نے بتایا کسی کا دوست نہ بن
مگر وہ زلفِ پریشان یاد و صبحِ وطن؟

قیودِ فن میں کہاں گھر سکے گی روحِ سخن
کہ عشق ہی کوئی فن ہے نہ زندگی کوئی فن

وفائے یار کو اے دل کہیں نظر نہ لگے
بہت ہی چست ہے اس جسم پر یہ پیراہن

جو دشمنی میں پلے تھے وہ ہیں رفیقِ سفر
جو دوست بننے چلے تھے وہ بن گئے دشمن

خیال و خواب مگر سو حقیقتیں قرباں!
وہ میری کانپتی پلکیں، وہ گوشۂ دامن

وہ تیرے جلوۂ اول کی یاد کا عالم
گلاب جیسے کھلے ہوں کہیں چمن بہ چمن

جفائے دوست میں شانِ کرم بھی شامل ہے
خدا نہ کردہ کوئی اور کیوں بنے دشمن

جلا دیے ہیں سرِ شام آنسوؤں نے چراغ
خیالِ یار کی ہر رہگزار ہے روشن

فریبِ فکر بھی دستِ طلب کی کوتاہی
غرورِ ناز ہیں اس نے بچا لیا دامن

وہ تیری آنکھ کا جادو، وہ چھاؤں قرگاں کی
کماں بدوش کمین گاہ میں چھپا دشمن

وہ آندھیوں میں گھری غم کی زندگی اپنی
وہ خوشبوؤں میں بسی تیری رہگزر کی پون

یہ کس دیار میں لائی ہے زندگی زیدی
نہ دوستی کا سلیقہ، نہ دلبری کا چلن

غزل

از جناب جوہر ٹونکی

کونین کی ہر شے ہمہ تن ساز بنی ہے
اب قلب کی دھڑکن تری آواز بنی ہے

قربان ترے اے مرحمتِ حسنِ تصور
کیا خلوتِ غم جلوہ گرِ ناز بنی ہے

محور تھی ہر دم جو نظر مرکزِ دل کی
اب وہ بھی نگاہِ غلط انداز بنی ہے

جرأت تھی کسے عرضِ تمنا کی کسی سے
وارفتگیٔ شوقِ سخن ساز بنی ہے

کم کنجِ قفس سے نہیں صیاد و گلشن
اک جرم جہاں جرأتِ پرواز بنی ہے

کیا تجھکو ہوا ہے مری خاموش نگاہی
کیوں رازِ غمِ عشق کی غماز بنی ہے

حسنِ تغزل

از ڈاکٹر ماتا پرشاد استھانہ زیبؔ بیلوی

میرے نغموں کے لیے وہ ساز ہو
دل کی دھڑکن سے ہم آواز ہو

پہلے پیدا دل میں سوز و ساز ہو
پھر نگاہوں سے نیاز و ناز ہو

کیوں جنوں میں انکشافِ راز ہو
کیوں شکستِ دل کی پھر آواز ہو

کم سے کم اتنا تو غم سے ساز ہو
دل کی بربادی پہ دل کو ناز ہو

ختم ارمانوں کا کیسے ہو ہجوم
جب نگاہِ دوست ارماں ساز ہو

بال و پر کی پرورش ہو جائیگی
پہلے پیدا جرأتِ پرواز ہو

احترامِ چشمِ ساقی فرض ہے
میکدے کا در تو لیکن باز ہو

لطف تو جب ہے کہ پیغامِ نظر
دل کے ہر پردے سے ہم آواز ہو

مطبوعاتِ جدیدہ

پاکستانی کلچر ـ از جمیل صاحب جالبی، صفحات ۲۴۴، کتابت وطباعت اعلیٰ، مع گرد پوش، ناشر مشتاق بک ڈپو، نزد اردو کالج شیلڈن روڈ، کراچی ۱۔

پاکستان کے وجود میں آتے ہی اس کے مشترک کلچر کا مسئلہ سامنے آیا، یعنی اس کا کلچر کیا ہو، یا کیا ہونا چاہیے، بدقسمتی سے پاکستان کے دو حصے ہیں، اور دونوں حصوں میں کسی مشترک کلچر کی تلاش از حد ضروری ہے، پاکستان کے تمام سوچنے والوں نے اس مسئلہ پر اپنی اپنی رائے دی ہے، اور اس موضوع پر اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان ہی میں یہ کتاب بھی ہے، چند الحاد پسندوں کو چھوڑ کر تقریباً ہر خیال وطبقہ کے اہل علم اس پر متفق ہیں، پاکستان میں مذہب کے علاوہ کوئی دوسری چیز مشترکہ کلچر نہیں بن سکتی ....

...... البتہ مذہب کی تعبیر میں بڑا اختلاف ہے، یہ اختلاف بھی دو نقطے پر سمٹ جاتے ہیں، ایک گروہ یہ کہتا ہے مذہب یعنی کتاب و سنت کی بنیادی تعلیمات اور اساسی قدریں ہیں جو دائمی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کو مشترکہ اصول مسلمہ تسلیم کر لینا چاہیے، دوسرا گروہ قرآن کو اپنی من مانی تاویلات کے ذریعہ مشترکہ کلچر کی اساس قرار دیتا ہے۔

مصنف نے ان تمام گروہوں اور ایک صدی کے ممتاز علماء کے خیالات کا جائزہ لیا ہے، اور دکھایا ہے کہ مذہب کی کوئی ایسی تشریح سامنے نہیں آسکی ہے جو پاکستان کلچر کی اساس بن سکے، مصنف کا بظاہر رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادیت اور روحانیت کے امتزاج کو پاکستان کا

مشترکہ کلچر بنانے کے خواہشمند ہیں، اگر مذہب کی موجودہ شکل میں یہ امتزاج انھیں کم ہی نظر آتا ہے۔
پھر اس کی عملی تشکیل کی صورتیں انکے ذہن میں واضح نہیں ہیں، مصنف کے تمام خیالات سے اتفاق کرنا تو
مشکل ہے ہی، اس میں اختلاف بھی ضروری ہے مگر اس مختصر تبصرہ میں اس کی گنجایش نہیں ہے، لیکن اس
موضوع پر جس وسعت نظری سے انھوں نے غور کیا ہے، اور ان عوامل کا جائزہ لیا ہے جو دنیا میں
نئی تبدیلی لارہے ہیں وہ قابل غور ضرور ہیں، اس کتاب سے اس موضوع پر سوچنے کا ایک دروازہ
کھلتا ہے۔

شہریت کی ابتدائی تعلیم۔ از مولانا ابراہیم عمادی ندوی، صفحات ۱۸۰، کتابت و
طباعت بہتر، پتہ: عثمانیہ کتب خانہ، پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۹، محمد علی بلڈنگ، بمبئی ۳۔

ہندوستان کے اہم مسائل میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں ایک اچھے شہری
بننے کا احساس کیسے پیدا کیا جائے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب شہریت کا احساس بچپن ہی سے ان میں
پیدا کیا جائے، اور پرائمری تعلیم کا یہ ایک اہم جز قرار دیا جائے، اس وقت آرٹ اور کلا کے نام
سے جنسی اور ذہنی انارکی پیدا کرنے والے پروگرام جو چلائے جارہے ہیں، اگر ان کے بجائے ان میں مذہبی
اور اخلاقی چیزوں کا احساس دلا کر ان کو شہری تہذیب سے سنوارا جائے تو امید ہے کہ تھوڑے
دنوں میں اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے، جیسا کہ مسٹر پرکاش رپورٹ میں اظہار کیا گیا ہے،

مولانا ابراہیم صاحب نے جو اس سے پہلے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں، اس کتاب کے
ذریعہ اس کمی کو بدرجہ اتم پورا کیا ہے، یہ کتاب یوں تو تمام بچوں کے لیے مفید ہے، مگر خاص طور پر
مسلمان بچوں کے لیے تو بے حد مفید ہے، امید ہے کہ یہ بہت سے اسکولوں میں داخل نصاب کرلی جائیگی۔

خلافت بنی امیہ۔ از مولانا سید رشید الوحیدی صاحب صفحات ۱۳۶، کتابت و
طباعت بہترین، ناشر قومی کتاب گھر، دیوبند۔

اس سے پہلے اس موضوع کی دو کتابیں رسول عربی اور خلافت راشدہ چھپ چکی ہیں، یہ تیسری
کتاب ہے، جو اسکول کے بچوں کے لیے سلیس زبان میں لکھی گئی ہے، اس کتاب میں اختصار کے ساتھ
بنو امیہ کے اہم خلفاء کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں، کتاب کا انداز بیان سلیس اور
دلکش ہے، امید ہے کہ کتاب مقبول ہوگی۔

اجماع اور باب اجتہاد۔ از کمال فاروقی صاحب صفحات ۸۴، ٹائپ عمدہ، ناشر مرکزی،
ادارہ تحقیقات اسلامی، حیدر علی روڈ، کراچی

اسلامی شریعت کے چار مآخذ میں ایک اہم ماخذ اجماع بھی ہے، پاکستان میں اسلامی دستور
کی تحریک نے جب سے زور پکڑا ہے، یہاں کے بہت سے سنجیدہ اہل علم نے اسلامی فقہ اور اس کی
وسعت کے ذرائع پر غور کرنا شروع کردیا ہے، اس غور و فکر کے نتیجہ میں کمال فاروقی صاحب نے
مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی موجودگی میں اجماع کے بارے میں
دس سوالات کیے تھے، مفتی صاحب نے بڑے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ ان سوالات کا جواب دیا،
یہ سوالات ۱۹۵۳ء میں کیے گئے تھے، اور اسی وقت یہ شائع بھی ہوگئے تھے، اب اسے دوسری بار
کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے،

کمال فاروقی صاحب نے جو سوالات کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ پر
خود بھی غور کیا ہے، یہ سوالات اور ان کے جوابات اس قابل ہیں کہ ان کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے،
البتہ مفتی صاحب کے جوابات کے بعد پھر کمال فاروقی صاحب نے ایک جوابی مکتوب اور نتائج فکر کے نام سے
دو اور ابواب کا اضافہ کیا ہے، مصنف کو اجماع کے سلسلہ میں سب سے زیادہ خلش اس بات کی تھی کہ
اس سے امت کے معصوم عن الخطا ہونے کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے، مفتی صاحب نے بھی اس کا جواب دیا ہے،
اور خود مصنف نے بھی اس کی توجیہ کی ہے، ہمیں مصنف کے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ علم اور